کوئی شکاری اگر جانور کے سایہ کو جانور سمجھ کر بندوق چلادے تو اس کی گولی اپنا نشانہ کھو دے گی، کارتوس خالی کرنے کے بعد بھی وہ اپنی مطلوبہ چیز سے محروم رہے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو زندگی کا نصب العین مقرر کرنے میں غلطی کر جائیں۔ اگر آپ نے نصب العین کا تعین صحیح نہیں کیا ہے تو آپ کی ساری کوششیں اور قربانیاں اسی طرح رائگاں چلی جائیں گی جس طرح کوئی شکاری غلط نشانہ پر بندوق چلادے اور بالآخر اس کے حصہ میں خالی کارتوس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

شمارہ ۹	زر تعاون سالانہ	۲۴ روپے	قیمت فی پرچہ
	خصوصی تعاون سالانہ	ایک سو روپے	
اگست ۱۹۷۷	بیرونی ممالک سے	۱۵ ڈالر امریکی	دو روپے

ذاتی معاملہ میں ہر آدمی حقیقت پسند ہوتا ہے۔ مگر ملی معاملہ ہو تو ہر آدمی جذباتی بن جاتا ہے۔ میں نے ایک شخص سے کہا "ذاتی معاملہ میں ہوشیار اور ملی معاملہ میں بیوقوف، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔"

جس شخص سے میں نے یہ بات کہی، وہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی تھا۔ مگر اس نے جو جواب دیا، وہ اس قابل ہے کہ اس کو نقل کیا جائے۔ اس نے کہا:

"وجہ بالکل سادہ ہے۔ ذاتی معاملہ میں نتیجہ مقصود ہوتا ہے اور ملی معاملہ میں لیڈری۔ بس اس کے سوا اس فرق کی اور کوئی وجہ نہیں۔"

یہ ایک واقعہ ہے کہ جب بھی یہ ذہن ہو گا کہ اپنی کوشش کو ایک حقیقی نتیجہ تک پہنچانا ہے تو آدمی معاملہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھے گا، وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے عمل کا نقشہ بنائے گا۔ وہ شور کی سیاست کے بجائے چپ کی سیاست اختیار کرے گا۔ اس کے برعکس لیڈری کا مزاج ہو تو ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ لیڈری تو ایک نعرہ، ایک پُرجوش تقریر، اخبار کی ایک سرخی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ حتی کہ اگر کوئی شخص ایسا اقدام کرے جو قوم کو بربادی کے آخری کنارے پر پہنچا دے، جب بھی اس کی لیڈری مسلّم رہے گی۔ لیڈر بننے کے لئے تعمیری نتیجہ نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر مفید بھی ہے۔ کیوں کہ اکثر حالات میں تخریبی اقدام آدمی کو اس سے زیادہ نمایاں کر دیتا ہے جتنا تعمیری اقدام۔ صرف اس اتفاقی خوش قسمتی کے ساتھ کہ آدمی اپنے تخریبی اقدام کو انقلابی اقدام کا نام دینے میں کامیاب ہو گیا ہو۔

(ظفر الاسلام خاں)

فہرست

اداریہ

الرسالہ کے متعلق ماہ جولائی کے شمارہ میں صفحہ ۶۳ پر جو سوال درج کیا گیا تھا اس سلسلے میں ایک تجویز یہ سامنے آئی ہے کہ الرسالہ حسب معمول اپنی موجودہ ماہانہ صورت میں نکلتا رہے۔ البتہ اسی کے ساتھ اس کی مزید افادیت کے لئے ایسا کیا جائے کہ اس کے متفرق طور پر چھپے ہوئے مضامین کا ایک موضوعاتی انتخاب ہر چند مہینے کے بعد شائع ہو۔ یعنی کسی خاص موضوع پر شائع شدہ مضامین جو مختلف شماروں میں بکھرے ہوئے ہیں، ان کو ایک عنوان کے تحت یکجا کر کے شائع کیا جائے۔ یہ مجموعہ ایک اعتبار سے ماہنامہ الرسالہ کا ایک نمبر ہوگا۔ دوسرے اعتبار سے وہ ۴۸ صفحات کا ایک کتابچہ ہوگا جو مستقل افادیت کا حامل ہوگا۔

ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بعض لوگ ہماری اجازت کے بغیر بطور خود الرسالہ کا چندہ جمع کر رہے ہیں۔ جب کہ ان کے پاس نہ ہماری رسید ہے اور نہ ہمارا اجازت نامہ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اب تک کتنے لوگ اس قسم کی کارروائیوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ تاہم ہم نہایت افسوس کے ساتھ معذرت خواہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اب تک کسی کو اس حیثیت سے اپنا نمائندہ مقرر نہیں کیا کہ وہ ہماری طرف سے لوگوں سے رقمیں وصول کرے۔ اگر اس کام کے لئے کسی کا تقرر ہوا تو الرسالہ میں اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔ فی الحال گزارش ہے کہ جو لوگ الرسالہ کے ساتھ تعاون کرنا چاہیں یا اس کا سالانہ بدل اشتراک ادا کرنا چاہیں، وہ براہ راست دفتر الرسالہ (جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی-۶) کو روانہ کریں۔ شخصی طور پر کسی کو کوئی رقم نہ دیں۔ جن لوگوں نے کسی کو رقمیں دی ہوں اور اس کی رسید ان کو اب تک نہ ملی ہو، وہ براہ کرم اپنے نام و پتہ اور مقدار رقم سے مطلع فرمائیں۔ نیز یہ کہ یہ رقم انھوں نے کس کو دی تھی۔

کتاب "الاسلام" کی افادیت کی بنا پر یہ تجویز سامنے آئی تھی کہ اس کی قیمت تخفیف کی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے اس سے استفادہ کرنا ممکن ہو سکے۔ اس تجویز کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے طالب علموں، اداروں نیز کم آمدنی والوں کے لئے الاسلام کی قیمت میں خصوصی رعایت کر دی گئی ہے۔ اس رعایت کے بعد انشاء اللہ کسی بھی طبقہ کے افراد کے لئے اس کو حاصل کرنا مشکل نہ رہے گا۔ اس سلسلے میں ضروری امور خط و کتابت کے ذریعہ معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

بعض استفسارات کے جواب میں اعلان کیا جاتا ہے کہ الرسالہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ نہ کسی کے شخصی ذوق کی تسکین کے لئے اس کو جاری کیا گیا ہے۔ یہ ایک تعمیری اور دعوتی مہم کا نقیب ہے، جو لوگ اس کے ساتھ تعاون کریں گے وہ کسی شخص کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے بلکہ ایک مقصد کے لئے تعاون کریں گے جو ان کا اور الرسالہ کا مشترک مقصد ہے۔

منی آرڈر اور ہر قسم کی ڈاک کے لئے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں

ماہنامہ الرسالہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

آہ! کس قلم سے لکھا جائے

چار سال پہلے کی بات ہے ۔ دار السلطنت میں ایک "بین اقوامی اسلامی اجتماع"
ہوا۔ اس میں شرکت کے لئے جنوب کے ایک شہر سے آنے والوں نے پوری ایک ٹرین رزرو کی۔
آمد و رفت اور ہالڈنگ چارج ملا کر اس کا بل تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے تھا۔ یہ اس "عظیم" اجتماع
کے کثیر اخراجات کا صرف ایک چھوٹا سا جزو تھا۔ راقم الحروف نے ایک ذمہ دار سے کہا: اس
ڈیڑھ لاکھ روپے کا زیادہ بہتر مصرف ہوتا اگر اس سے کتاب اللہ کا ملکی زبان میں ترجمہ چھاپ
کر برادران وطن تک پہنچا دیا جاتا ۔

"آپ جانتے نہیں،" انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اپنا سفر رزرو ٹرین سے
طے کرنے کے محرک نے یہ ڈیڑھ لاکھ روپے ان کی جیب سے نکالے ہیں۔ ترجمۂ قرآن کے نام پر ہم
یہ پیسے ان سے وصول نہیں کر سکتے "

یہی قوم کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے ۔ اس کو صرف بے فائدہ نعروں پر متحرک کیا
جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ جو نعرہ جتنا زیادہ بے معنی ہو، اتنا ہی زیادہ وہ اس کے لئے جوش و خروش
دکھاتی ہے۔ حال میں پڑوسی ملک میں حکومت کے خلاف "اسلامی محاذ" قائم کیا گیا۔ اس کے
لئے مسلمانوں نے کروروں روپے نذر کر دیئے۔ اگرچہ اس محاذ کا معلوم یقینی انجام صرف
یہ ہونا تھا کہ وہ قوم کا مزید اربوں روپیہ برباد کر کے ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے ــــــــ
پچھلے تقریباً دو سو برس سے پوری قوم مسلسل اسی قسم کی "قربانیاں" دینے میں مصروف ہے۔
کوئی صحیح آواز اس کو اپیل نہیں کرتی ۔

آہ وہ قوم جس کا حال اِس آیت قرآنی کا مصداق ہو جائے:

"اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں ۔ اور اگر گمراہی
کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ بنا لیں" اعراف ـ ۱۴۶

وحید الدین ، ۷ ؍ جولائی ۱۹۷۷

قرآن : ایک لسانی معجزہ

جتنی بھی قدیم کتابیں آج دنیا میں پائی جاتی ہیں، ان میں قرآن ایک حیرت انگیز استثناء ہے، تمام مقدس کتابوں کی اصل زبانیں تاریخ کی الماری میں بند ہو چکی ہیں۔ مگر قرآن کی زبان (عربی) آج بھی بدستور زندہ ہے۔ آج بھی کروڑوں انسان اس زبان کو لکھتے اور بولتے ہیں جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے قرآن اتارا گیا تھا ——— یہ واقعہ قرآن کے معجزاتی کتاب ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ کیونکہ قرآن کے سوا ساری انسانی تاریخ میں کوئی دوسری کتاب نہیں جس نے اپنی اصل زبان کو اس طرح بعد کے زمانوں میں باقی رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔

مثال کے طور پر انجیل کو لیجئے جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قریب العہد مقدس کتاب ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ ابھی تک قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں معلوم کہ حضرت مسیح کون سی زبان بولتے تھے۔ قیاساً یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان غالباً آرامی تھی۔ تاہم انجیل کی شکل میں آپ کی تعلیمات کا جو بالواسطہ ریکارڈ آج ہمارے پاس ہے اس کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں پایا جاتا ہے۔ گویا حضرت مسیح کے خیالات صرف ترجمہ شدہ حالت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ پھر یہ یونانی زبان بھی قدیم و جدید یونانی سے بالکل مختلف ہے حتیٰ کہ انیسویں صدی کے آخر تک نئے عہد نامہ میں کم از کم ۵۵۰ الفاظ (کل متن کا ۱۲ فی صد) ایسے تھے جن کے معانی معلوم نہ تھے۔ انیسویں صدی میں ایک جرمن عالم اڈولف ڈیزمن (ADOLF DEISSMANN) نے مصر میں بعض قدیم تحریریں پائیں۔ ان کے مطالعہ کے بعد اس نے قیاس کیا کہ "ببلیکل گریک" دراصل قدیم یونانی زبان کی غیر علمی بولی تھی جو پہلی صدی عیسوی میں فلسطین کے عوام میں رائج تھی۔ اس نے مذکورہ نامعلوم الفاظ کے کچھ معانی متعین کیے۔ تاہم اب بھی یونانی انجیل میں ۵۰ الفاظ (کل متن کا ایک فی صد) ایسے ہیں جن کے معانی ابھی تک نامعلوم ہیں۔ (صفحہ ۸۰ - ۷۹)

XAVIER LEON-DUFOUR S.J.,
THE GOSPELS AND THE JESUS OF HISTORY
DESCLEE CO. INC.,
NEW YORK 1970, pp.312

ارنسٹ رینان (۱۸۹۲ - ۱۸۲۳) نے عربی زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنی کتاب اللغات السامیہ میں لکھا ہے:

> "انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ عربی زبان ہے۔ یہ زبان قدیم تاریخ میں ایک غیر معروف زبان تھی۔ پھر اچانک وہ ایک کامل زبان کی حیثیت سے ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد سے اس میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہ ہو سکی حتیٰ کہ اس کا نہ کوئی بچپن ہے اور نہ بڑھاپا۔ وہ اپنے ظہور کے اول دن جیسی تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔"

قرآن کی زبان کے بارے میں فرانسیسی مستشرق کا یہ اعتراف دراصل اعجاز قرآن کا اعتراف ہے۔ کیونکہ حقیقۃً یہ قرآن کا معجزاتی ادب ہی ہے جس نے عربی زبان کو تبدیلی کے اس عام تاریخی قانون سے مستثنیٰ رکھا جس سے دوسری تمام زبانیں متاثر

ہوئی ہیں۔ مسیحی عالم جرجی زیدان (۱۹۱۴ - ۱۸۶۱) نے اپنی کتاب آداب اللغۃ العربیہ میں اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے :

وبالجملۃ فان للقرآن تاثیرا فی آداب اللغۃ العربیۃ لیس لکتاب دینی مثلہ فی اللغات الاخریٰ	مختصر یہ کہ عربی زبان کے ادب پر قرآن نے ایسا غیر معمولی اثر ڈالا ہے جس کی مثال کسی اور دینی کتاب کی دوسری زبانوں میں نہیں ملتی ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں تبدیلی کا شکار رہی ہیں۔ حتیٰ کہ کسی زبان کا آج کا ایک عالم اس زبان کی چند سو برس پہلے کی کتاب کو لغت اور شرح کی مدد کے بغیر سمجھ نہیں سکتا۔ اس تبدیلی کے اسباب عام طور پر دو قسم کے رہے ہیں۔ ایک، اجتماعی انقلاب، دوسرے، ادبی ارتقار۔ عربی زبان کے ساتھ پچھلی صدیوں میں یہ دونوں واقعات اسی شدت کے ساتھ پیش آئے جس طرح کسی دوسری زبان کے ساتھ پیش آسکتے ہیں۔ مگر وہ اس زبان کے لسانی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہ کر سکے۔ عربی زبان اب بھی وہی زبان ہے جو چودہ سو برس پہلے نزول قرآن کے وقت مکہ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ہومر (م ۸۵۰ ق م) کی الیڈ، تلسی داس (م ۱۶۲۳ء) کی رامائن، اور شیکسپیئر (۱۶۱۶ - ۱۵۶۴) کے ڈرامے انسانی ادب کا شاہکار سمجھے جاتے ہیں اور زمانہ تالیف سے لے کر اب تک مسلسل پڑھے جاتے رہے ہیں۔ مگر وہ ان زبانوں کو اپنی ابتدائی شکل میں محفوظ نہ رکھ سکے جن میں وہ لکھے گئے تھے۔ ان کی زبانیں اب کلاسیکس کی زبانیں ہیں نہ کہ زندہ زبانیں۔ زبانوں کی تاریخ میں قرآن واحد مثال ہے جو مختلف قسم کے علمی اور سیاسی انقلابات کے باوجود اپنی زبان کو مسلسل اسی حالت پر باقی رکھے ہوئے ہے جس حالت پر وہ نزول قرآن کے وقت تھی۔ انسانی سماج کی کوئی بھی تبدیلی اُس میں تبدیلی کا باعث نہ بن سکی۔ یہ واقعہ قرآن کے ایک برتر کلام ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ پچھلے ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ قرآن ایک معجزہ ہے۔ اس کے بعد اعجاز قرآن کے لئے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

اجتماعی انقلابات

اجتماعی انقلابات کس طرح زبانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس کو سمجھنے کے لئے لاطینی کی مثال لیجئے۔ لاطینی کا مرکز بعد کے دور میں اگرچہ اٹلی بنا، مگر اصلاً یہ زبان اٹلی کی پیداوار نہ تھی۔ تقریباً ۱۲ سو قبل مسیح، لوہے کا زمانہ آنے کے بعد، جب وسط یورپ کے قبائل اطراف کے علاقوں میں پھیلے تو ان کی ایک تعداد، خاص طور پر کوہ الپس کے قبائل اٹلی میں داخل ہوئے اور روم اور اس کے آس پاس آباد ہوئے۔ ان کی بولی اور مقامی بولی کے ملنے سے جو زبان بنی وہی ابتدائی لاطینی زبان تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں لیوبس اینڈ رونیکس نے یونانی زبان کے کچھ ڈراموں اور کہانیوں کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ اس طرح لاطینی زبان ادبی زبان کے دور میں داخل ہوئی۔ پہلی صدی قبل مسیح میں رومی سلطنت قائم ہوئی تو اس نے لاطینی کو اپنی سرکاری زبان بنایا۔ مسیحیت کے پھیلاؤ سے بھی اس کو تقویت ملی۔ اس طرح مذہب اور سیاست نیز سماجی اور اقتصادی ذرائع پر اس کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ قدیم یورپ کے تقریباً پورے علاقہ میں

پھیل گئی۔ سینٹ آگسٹین (۴۳۰-۳۵۴) کے زمانے میں لاطینی اپنے عروج پر تھی۔ قرون وسطیٰ میں لاطینی زبان دنیا کی سب سے بڑی بین اقوامی زبان سمجھی جاتی تھی۔

آٹھویں صدی میں مسلم قومیں ابھریں اور انھوں نے رومی سلطنت کو توڑ کر اس کو قسطنطنیہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ ۱۴۵۳ میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے وہاں سے بھی اس کا خاتمہ کر دیا۔

ہزار برس قبل جب رومی شہنشاہیت ٹوٹی تو مختلف علاقائی بولیوں کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ یہی بولیاں، لاطینی کی آمیزش کے ساتھ بعد کو وہ زبانیں بنیں جن کو آج ہم فرانسیسی، اطالوی، اسپینی، پرتگالی، رومانوی زبانیں کہتے ہیں۔ اب لاطینی زبان صرف رومن کلیسا کی عبادتی زبان ہے اور سائنس اور قانون کی اصطلاحات میں استعمال ہوتی ہے۔ اب وہ کوئی زندہ زبان نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت تاریخی ہے۔ مثال کے طور پر نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) کی پرنسپیا کوئی اصل زبان میں پڑھنا چاہے تو اس کو قدیم لاطینی زبان سیکھنی پڑے گی۔

یہی معاملہ تمام قدیم زبانوں کے ساتھ ہوا ہے۔ ہر زبان مختلف سماجی حالات کے تحت بدلتی رہی۔ یہاں تک کہ ابتدائی زبان ختم ہوگئی اور اس کی جگہ دوسری بدلی ہوئی زبان نے لے لی۔ قومی اختلاط، تہذیبی تصادم، سیاسی انقلاب، زمانی تبدیلی جب بھی کسی زبان کے ساتھ پیش آئے ہیں تو وہ بدل کر کچھ سے کچھ ہوگئی ہے۔ یہی تمام حالات پچھلے ڈیڑھ ہزار برس میں عربی زبان کے ساتھ بھی پیش آئے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ عربی زبان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس تغیر پذیر لسانی دنیا میں عربی کا غیر تغیر پذیر رہنا تمام تر قرآن کا معجزہ ہے۔

۷۰ء میں یہودی قبائل شام سے نکل کر یثرب (مدینہ) آئے۔ یہاں اس وقت عمالقہ آباد تھے جن کی زبان عربی تھی۔ عمالقہ کے ساتھ اختلاط کے بعد یہودی نسلوں کی زبان عربی ہوگئی۔ تاہم ان کی عربی عام عربوں کی زبان سے مختلف تھی۔ وہ عبری اور عربی کا ایک مرکب تھی۔ یہی واقعہ اسلام کے بعد عربوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش آیا جب کہ وہ اپنے وطن عرب سے نکلے اور ایشیا اور افریقہ کے ان ملکوں میں داخل ہوئے جہاں کی زبانیں دوسری تھیں۔ مگر اس اختلاط کا کوئی اثر ان کی زبان پر نہیں پڑا۔ عربی بدستور اپنی اصل حالت پر محفوظ رہی۔

نزول قرآن کے بعد عربی زبان کے لیے اس قسم کا پہلا موقع خود صدر اول میں پیش آیا۔ اسلام عرب کے مختلف قبائل میں پھیلا۔ وہ لوگ اسلامی شہروں میں یک جا ہونے لگے۔ مختلف قبائل کی زبانیں تلفظ، لب و لہجہ وغیرہ کے اعتبار سے کافی مختلف تھیں۔ ابو عمرو بن العلاء کو کہنا پڑا تھا: مالسان حمیر بلساننا ولا لغتھم بلغتنا (قبیلہ حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے) حضرت عمرؓ نے ایک بار ایک اعرابی کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو اس کو پکڑ کر آنحضورؐ کے پاس لائے۔ کیونکہ وہ الفاظ قرآن کو اتنے مختلف ڈھنگ سے ادا کر رہا تھا کہ حضرت عمرؓ یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ قرآن کا کون سا حصہ پڑھ رہا ہے۔ اسی طرح آنحضورؐ نے ایک بار ایک عرب قبیلہ کے وفد سے اس کی اپنی بولی میں گفتگو کی تو حضرت علیؓ کو ایسا محسوس ہوا جیسے آپؐ کوئی اور زبان بول رہے ہیں۔

اس کی بڑی وجہ لہجوں کا اختلاف تھا۔ مثلاً بنو تمیم جو مشرقی نجد میں رہتے تھے۔ وہ جیم کا تلفظ یا سے کرتے تھے، وہ

مسجد کو مسید اور شجرات کو سرات کہتے تھے۔ اسی طرح بنو تمیم ق کو جیم بولتے تھے۔ مثلاً طریق کو طریج، صدیق کو صدیج، قدر کو جدر اور قاسم کو جاسم کہتے تھے۔ اس طرح مختلف قبائل کے ملنے سے لسانی تاریخ کے عام قانون کے مطابق ایک نیا عمل شروع ہونا چاہئے تھا جو بالآخر ایک نئی زبان کی تشکیل پر منتج ہوتا۔ مگر قرآن کے برتر ادب نے عربی زبان کو اس طرح اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا کہ اس کے اندر اس قسم کا عمل جاری نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس وہ واقعہ پیش آیا جس کو ڈاکٹر احمد حسین زیات نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

ما کانت لغة مُضَرَ بعد الاسلام لغة امة واحدة و انما کانت لغة لجميع الشعوب التی دخلت فی دین الله

اسلام کے بعد عربی زبان، ایک قوم کی زبان نہیں رہی۔ بلکہ ان تمام قبائل کی زبان بن گئی جو خدا کے دین میں داخل ہوئے تھے۔

پھر یہ عرب مسلمان اپنے ملک سے باہر نکلے۔ انھوں نے ایک طرف جبل الطارق تک اور دوسری طرف کاشغر تک فتح کر ڈالا۔ ان علاقوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ وہ فارسی، قبطی، بربری، عبرانی، سریانی، یونانی، لاطینی، آرامی زبانیں بولتے اور لکھتے تھے۔ ان میں ایسی قومیں بھی تھیں جو اپنے سیاسی نظام اور اپنے تمدن میں عربوں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ عراق میں داخل ہوئے جو ایک قدیم تمدن کا حامل تھا اور بڑی بڑی قوموں کا مرکز رہ چکا تھا۔ ان کا ایران سے اختلاط ہوا جو اس وقت کی دو عظیم ترین شہنشاہیتوں میں سے ایک تھا۔ ان کا تصادم رومی تہذیب اور عیسائی مذہب سے ہوا جو زبردست ترقی کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ ان کا سابقہ شام سے پیش آیا جہاں فینیقی، کنعانی، مصری، یونانی، غسانی قوموں نے اپنے آداب و اطوار کے نمایاں اثرات چھوڑے تھے۔ ان کا مقابلہ مصر سے ہوا جہاں مشرق و مغرب کے فلسفے آکر ملے تھے۔ یہ اسباب بالکل کافی تھے کہ عربی میں ایک نیا عمل شروع ہو اور ابتدائی زبان کے ساتھ ان نئے عوامل کے اثر سے ایک اور زبان وجود میں آجائے جیسا کہ دوسری زبانوں کے ساتھ ہوا۔ مگر اتنے بڑے لسانی بھونچال کے باوجود قرآن اس زبان کے لئے ایک ایسا برتر معیار بنا رہا جس نے تمام دوسرے عوامل کو اس کے لئے بے حقیقت بنا دیا۔

اسلام کی فتوحات کے بعد عربی زبان صرف ایک ملک کی زبان نہ رہی بلکہ کئی درجن ملکوں اور قوموں کی زبان بن گئی۔ ایشیا اور افریقہ کی عجمی اقوام نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی زبان بھی دھیرے دھیرے عربی بن گئی۔ فطری طور پر ان غیر ملکی اقوام میں عربی زبان بولنے کی وہ قدرت نہ تھی جو خود عربوں میں تھی۔ ان کی زبان میں اپنی غیر عربی زبانوں کے اثر سے بہت سی خامیاں پیدا ہو گئیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ خود عربوں میں جو لوگ زیادہ باشعور نہ تھے، دھیرے دھیرے وہ ان قوموں سے اثر لینے لگے۔ یہاں تک کہ خود ان کی زبان بدلنا شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے شہروں میں یہ غلطیاں سب سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ یہاں مختلف قوموں کے لوگ جمع تھے۔ بڑھتے بڑھتے یہ خرابی خواص تک پہنچ گئی۔ زیاد بن امیہ کے دربار میں ایک بار ایک شخص آیا اور بولا: توفی ابانا و ترك بنون (ہمارا باپ مر گیا اور اولاد چھوڑ گیا) اس جملہ میں ابانا کی جگہ ابونا ہونا چاہئے تھا اور بنون کی جگہ بنین۔ اس طرح کے بے شمار فروق پیدا ہو گئے۔ دیگر تاریخی زبانوں

کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہی عربی زبان کے ساتھ بھی لازماً ہوتا۔ مگر یہاں بھی قرآن کی ادبی عظمت عربی کے لئے ڈھال بن گئی اور عربی زبان کی صورت پھر بھی وہی باقی رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دی تھی۔

اس طرح کے واقعات جو عربی زبان کی پچھلی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں بار بار پیش آئے ہیں قرآن کے معجزہ ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ کیونکہ یہ تمام تر قرآن کی عظمت ہی کا نتیجہ تھا جس نے عربی کو کسی تغیری عمل کا معمول بننے نہ دیا۔

دوسری صدی ہجری میں اموی سلطنت کا خاتمہ اور عباسی سلطنت کا قیام عربی زبان کے لئے زبردست فتنہ تھا۔ بنی امیہ کی حکومت خالص عربی حکومت تھی۔ اموی حکمراں عرب قومیت اور عربی زبان و ادب کی حمایت میں جانب داری اور تعصب کی حد تک سخت تھے۔ انھوں نے اپنا پایہ تخت دمشق کو بنایا تھا جو عرب دیہات کی سرحد پر واقع تھا۔ ان کی فوج، دفتری عملہ اور افسران سب عرب ہوا کرتے تھے۔ مگر عباسی حکومت میں ایرانیوں کا غلبہ ہوگیا۔ عباسیوں نے ایرانیوں ہی کی مدد سے بنی امیہ کا خاتمہ کیا تھا، اس لیے ان کے نظم و نسق میں ایرانی اعاجم کا عمل دخل ہو جانا لازمی تھا، حتیٰ کہ عباسیوں نے دار الخلافہ بغداد کو قرار دیا جو ایران سے بہت قریب تھا۔ انھوں نے ایرانیوں کو اتنی چھوٹ دی کہ وہ حکومت کے سارے معاملات میں آزادانہ کارروائیاں کرنے لگے۔ انھوں نے عرب اور عرب تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور اس کو بالقصد کمزور کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ عربی عصبیت کے کمزور ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی، ترکی، سریانی، رومی اور بربری عناصر حکومت اور سماج کے تمام معاملات پر چھا گئے۔ عربوں اور غیر عربوں میں رشتہ داریاں قائم ہوئیں۔ آریائی تہذیب اور سامی تہذیب کے ملنے سے زبان اور تہذیب میں نیا انقلاب آگیا۔ اکاسرہ کے پوتے اور قدیم جاگیرداروں کے بیٹے پھر سے ابھر آئے۔ انھوں نے اپنے آبا و اجداد کی تہذیب کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

ان واقعات کا عربی زبان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ متنبی (۹۶۵ - ۹۱۵ء) کے زمانہ میں عربی کی جو حالت ہو چکی تھی، اس کا اندازہ اس کے چند اشعار سے ہوتا ہے:

مَغانی الشِّعبِ طِیباً فِی المَغانی	بِمَنزِلَةِ الربیعِ مِنَ الزَّمانِ
وَلٰکِنَّ الفَتَی العَرَبِیَّ فِیہا	غَریبُ الوَجہِ وَالیَدِ وَاللِّسانِ
مَلاعِبُ جِنَّةٍ لَو سَارَ فِیہا	سُلَیمانٌ لَسارَ بِتَرجُمانِ

شرح دیوان المتنبی (بیروت ۱۹۳۸) صفحہ ۳۸۴

"شعب بوان (ایران) کے مکانات عمدگی میں تمام مکانوں سے اسی طرح بڑھے ہوئے ہیں جس طرح زمانہ کی تمام فصلوں میں بہار کی فصل۔ مگر اس بستی میں ایک عرب جوان (یعنی) اپنے چہرہ، ہاتھ اور زبان کے لحاظ سے بالکل اجنبی ہے۔ سلیمان جن کے تابع جنات تھے (جو جانوروں تک کی بولیاں سمجھتے تھے) اگر اس علاقہ میں آئیں تو انھیں اپنے ساتھ ترجمان رکھنا پڑے گا۔" —— ترکوں اور کردوں نے بھی اس سلسلے میں ایرانیوں کی تقلید کی۔ مگر قرآن کی ادبی عظمت عربی زبان کے لئے ڈھال بنی رہی۔ اس قسم کی کوششوں سے وقتی ہل چل تو ضرور پیدا ہوئی مگر جلد ہی وہ دب کر رہ گئی اور عربی زبان میں کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔

خلیفہ متوکل (۲۳۲ - ۲۴۷ھ) کے بعد عجمی اقوام، ایرانی اور ترک، عرب علاقہ میں بہت زیادہ دخیل ہوگئے۔ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں نے بغداد کی سلطنت کو برباد کردیا۔ ۸۹۸ھ میں اندلس کی عرب حکومت کو یورپی اقوام نے ختم کردیا۔ ۹۲۲ھ میں مصر و شام سے فاطمیوں کا خاتمہ ہوگیا اور ان عرب علاقوں کی حکومت عثمانی ترکوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ اسلامی حکومت کا دارالسلطنت قاہرہ کے بجائے قسطنطنیہ ہوگیا۔ سرکاری زبان عربی کے بجائے ترکی قرار پائی۔ عربی زبان میں غیر زبان کے الفاظ اور اسالیب کثرت سے آنے لگے۔

عالم عرب پر ساڑھے پانچ سو سال ایسے گزرے ہیں جب کہ تمام عرب دنیا عجمی بادشاہوں کے جھنڈے کے نیچے رہی، حتیٰ کہ مغل، ترک اور ایرانی حکمراں عرب آثار تک کو مٹانے پر تلے رہے۔ عربی کے کتب خانے جلائے گئے، مدرسے اجاڑے گئے، علماء کو ذلیل کیا گیا۔ عثمانی سلطنت نے اپنی ساری طاقت کے ساتھ عربوں کو ترک بنانے کی وہ مہم چلائی جس کو جمال الدین افغانی نے بجا طور پر "تتریک العرب" کہا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی واقعہ بھی عربی زبان میں کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہ کرسکا۔ بغداد و بخارا میں تاتاریوں نے، شام میں صلیبیوں نے اور اندلس میں یورپی قوموں نے عربی زبان و ادب اور عرب تہذیب کو جو نقصانات پہنچائے وہ عربی زبان کا نام و نشان مٹانے کے لئے بالکل کافی تھے۔ اس کے بعد، دوسری زبانوں کی تاریخ کے مطابق، یہ ہونا چاہیے تھا کہ عربی زبان اپنی دیگر سامی زبانوں سے مل جاتی۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ترکوں کی جہالت اور ایرانیوں کا تعصب اگر حائل نہ ہوا ہوتا تو عربی زبان آج تمام دنیا کے مسلمانوں کی واحد زبان ہوتی۔
تاہم جہاں تک عرب علاقہ کا تعلق ہے، وہاں اس کا بدستور اپنی سابقہ شان میں باقی رہ جانا تمام تر قرآن ہی کا معجزہ تھا۔ قرآن کی عظمت نے اس مدت میں لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ عربی زبان سے اپنا تعلق حکومت و اقتدار کے علی الرغم باقی رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بھی بے شمار ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے عربی زبان و ادب کی خدمت کی۔ مثال کے طور پر ابن منظور (۶۳۰ - ۷۱۱ھ) ابن خلدون (۷۳۲ - ۸۰۸ھ) وغیرہ۔

نپولین کے قاہرہ میں داخلہ ۱۷۹۸ء کے بعد جب مصر میں پریس آیا اور تعلیم کا دور دورہ ہوا تو عربی زبان کو نئی زندگی ملی تاہم پچھلے سیکڑوں برس کے حالات نے یہ صورت حال پیدا کردی تھی کہ مصر و شام کے دفاتر کی زبان ترکی و عربی کا ایک مرکب تھا۔

۱۸۸۲ء میں مصر پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد پھر صورت حال بدلی۔ انھوں نے عربی کے خلاف اپنی ساری طاقت لگادی۔ تمام تعلیم انگریزی کے ذریعہ لازمی کردی گئی۔ مختلف زبانیں سکھانے کے ادارے ختم کردیے گئے۔ اسی طرح جن عرب علاقوں پر فرانسیسیوں کا غلبہ ہوا، وہاں انھوں نے فرانسیسی کو رواج دیا۔ مگر تقریباً سو سال تک انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے غلبہ کے باوجود عربی زبان بدستور اپنی اصل حالت پر باقی رہی۔ اس میں الفاظ کی وسعت ضرور پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر ٹینک کے لئے دبابہ کا لفظ رائج ہوا جو پہلے معروف منجنیق کے لئے بولا جاتا تھا۔ اسی طرح طرز بیان میں وسعت پیدا ہوئی۔ مثلاً نو مسلموں کے حالات پر آج ایک کتاب شائع ہو تو اس کا نام رکھا جاتا ہے لماذا اسلمنا۔ جب کہ اس سے پہلے مسجع و مقفیٰ ناموں کا رواج تھا۔ اسی طرح بہت سے الفاظ معرب ہوکر رائج ہوئے مثلاً دکتور (ڈاکٹر)، بکرا سے

اصل زبان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اصل زبان بدستور وہی آج بھی ہے جو قرآن کے نزول کے وقت مکہ میں رائج تھی۔

ادبی ارتقار

زبانوں میں تبدیلی کا دوسرا سبب ادیبوں اور مصنفوں کے کارنامے ہیں۔ جب بھی کوئی غیر معمولی ادیب یا مصنف پیدا ہوتا ہے، وہ زبان کو کھینچ کر نئے لسانی اسلوب کی طرف لے جاتا ہے۔ اس طرح زبان تبدیلی اور ارتقار کے مراحل طے کرتی رہتی ہے، اور بدلتے بدلتے کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ عربی زبان میں اس کے برعکس، ایسا ہوا کہ قرآن نے اول روز ہی ایسا برتر معیار سامنے رکھ دیا کہ کسی انسانی ادیب کے لئے ممکن نہ ہو سکا کہ وہ اس سے اوپر جا سکے۔ اس لئے عربی زبان اسی اسلوب پر باقی رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، عربی زبان میں قرآن کے بعد کوئی دوسرا "قرآن" نہ لکھا جا سکا۔ اس لئے زبان بھی قرآنی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہ بن سکی۔

انگریزی زبان کی مثال لیجئے۔ ساتویں صدی عیسوی میں وہ ایک معمولی مقامی بولی کی حیثیت رکھتی تھی جس میں کسی علمی خیال کو ظاہر کرنا ممکن نہ تھا۔ پانچ سو برس سے بھی زیادہ عرصہ تک یہی حال رہا۔ انگریزی زبان کا معمار اول جافرے چاسر (۱۴۰۰-۱۳۴۰) پیدا ہوا تو انگلستان کی درباری زبان فرانسیسی تھی۔ چاسر جو لاطینی، فرانسیسی اور اطالوی زبانیں جانتا تھا، اس نے انگریزی میں اشعار کہے اور نظمیں لکھیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت اور دیگر زبانوں سے واقفیت کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب ہو سکا کہ انگریزی بولی کو آگے لے جائے اور اس کو ایک علمی زبان کا روپ دے۔ ہاسر (ERNEST HAUSER) کے الفاظ میں اس نے اپنی کامیاب نظموں کے ذریعہ انگریزی کو ایک مضبوط بڑھاوا (FIRM BOOST) دیا۔ اس نے ایک بولی کو ایسی طاقت ور زبان بنا دیا جس میں ترقی کے نئے امکانات چھپے ہوئے تھے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ۔ جون ۱۹۷۵)

دو سو برس تک چاسر انگریزی شاعروں اور ادیبوں کا رہنما بنا رہا۔ یہاں تک کہ ولیم شکسپیر (۱۶۲۵-۱۵۵۸) کا ظہور ہوا جس نے چاسر سے زیادہ برتر ادب کا نمونہ پیش کیا۔ اپنے اشعار اور ڈراموں کے ذریعہ اس نے انگریزی کو دوبارہ ایک نیا معیار عطا کیا۔ اب انگریزی زبان ایک قدم اور آگے بڑھی اور ترقی کی نئی شاہراہ پر سفر کرنے لگی۔ یہ دور تقریباً ایک سو برس تک رہا، یہاں تک کہ سائنس کے ظہور نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی، دوبارہ نئے معیار قائم کرنے شروع کئے۔ اب شعر کے بجائے نثر، اور افسانہ نویسی کے بجائے واقعہ نگاری کو اہمیت ملنے لگی۔ اس کے اثر سے انگریزی میں سائنٹفک اسلوب وجود میں آیا۔ سویفٹ (۱۷۴۵-۱۶۶۷) سے لے کر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (۱۸۸۸-) تک درجنوں ادیب پیدا ہوئے جنھوں نے زبان کو وہ نیا معیار عطا کیا جس سے اب ہم گزر رہے ہیں۔

یہی عمل تمام زبانوں میں ہوا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا زیادہ [illegible] والا ادیب یا ادیبوں کا گروہ اٹھتا ہے اور وہ [illegible] کو نیا اسلوب دے کر نئے مرحلے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس طرح زبان بدلتی رہتی ہے یہاں تک کہ چند صدیاں گزرنے کے بعد اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ اگلے لوگ پچھلی زبان کو لغات اور شرح کے بغیر سمجھ ہی نہ سکیں۔

اس کلیہ سے صرف ایک زبان مستثنیٰ ہے اور وہ عربی زبان ہے۔ یہی واقعہ قرآن کے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ کوئی شخص قرآن جیسی کتاب وضع نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ پچھلی صدیوں میں

متعدد لوگوں نے قرآن کے جواب میں دوسرا قرآن لکھنے کی کوشش کی، مگر سب کے سب ناکام رہے۔ مثال کے طور پر مسیلمہ بن حبیب، طلیحہ بن خویلد، نضر بن الحارث، ابن الراوندی، ابو العلاء المعری، ابن المقفع، متنبی وغیرہ۔ اس سلسلے میں ان کی جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں، وہ اتنی سطحی ہیں کہ قرآن کے مقابلہ میں ان کو رکھنا بھی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً مسیلمہ کے "قرآن" کا ایک حصہ یہ تھا:

یا ضفدع نقی ما تنقین، فلا الماء تکدرین ولا الشارب تمنعین

اے مینڈک کی جتنا ٹرا سکے ٹرا لے، تو نہ پانی کو گدلا کرے گی نہ پینے والوں کو روکے گی۔

اسی طرح مسیلمہ کا ایک اور "الہام" یہ تھا:

لقد انعم اللہ علی الحبلی، اخرج منہا نسمۃ تسعی، من بین صفاق وحشا

تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد دوم، صفحہ ۱۲۱

اللہ نے حاملہ عورت پر بڑا انعام کیا ہے، اس کے اندر سے دوڑتی ہوئی جان نکالی، جھلی اور پیٹ کے اندر سے

تاہم اس سے بھی زیادہ بڑا ثبوت وہ مسلسل واقعہ ہے جس کو ارنسٹ رینان نے ایک لسانی عجوبہ قرار دیا ہے جس طرح دوسری زبانوں میں زبان آور پیدا ہوئے، اسی طرح عربی میں بھی شعراء اور ادبا اور مصنفین پیدا ہوئے اور پیدا ہو رہے ہیں، مگر اس پوری مدت میں کوئی ایسا زباں داں نہ اٹھا جو قرآن سے برتر ادب پیش کر کے عربی میں نیا لسانی معیار قائم کرتا اور زبان کو نئے مرحلہ کی طرف لے جاتا۔ اس لئے زبان اسی مرحلۂ ترقی پر قائم رہی جو قرآن نے اس کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ اگر دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے جو قرآن کے مقابلہ میں زیادہ اعلیٰ ادب کا نمونہ پیش کرتے تو ناممکن تھا کہ زبان ایک مقام پر رکی رہے۔

قرآن کی مثال عربی زبان میں ایسی ہی ہے جیسے کسی زبان میں آخری اعلیٰ ترین ادیب اول روز ہی پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کوئی ایسا ادیب نہیں ابھرے گا جو زبان میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ قرآن کے نزول کے زمانہ میں جو زبان عرب میں رائج تھی، اس کو ترقی دے کر قرآن نے اعلیٰ ترین ادب کی شکل میں ڈھال دیا۔ اس کے بعد اس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہ تھا۔

قرآن نے عربی کے روایتی اسالیب پر اضافے کر کے اس میں توسیع کا دروازہ کھولا۔ مثال کے طور پر سورہ اخلاص میں لفظ "احد" کا استعمال۔ عربی زبان میں اس سے پہلے یہ لفظ مضاف مضاف الیہ کے طور پر استعمال ہوتا آیا تھا جیسے یوم الاحد (ہفتے کا دن) یا نفیٔ عام کے لئے جیسے ما جاءنی احد (میرے پاس کوئی نہیں آیا) وغیرہ مگر قرآن نے یہاں لفظ احد کو ہستی باری تعالیٰ کے لئے وصف کے طور پر استعمال کیا جو عربی زبان میں غیر معمولی تھا۔

عربی میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کئے مثلاً استبرق، سرادق (فارسی)، صراط (یونانی)، یم (سامی) اسی طرح قسطاس، سجیل، مشکاۃ، جبت، سندس، زنجبیل وغیرہ۔ مکہ کے مشرکین نے جب کہا تھا کہ وما الرحمٰن (فرقان۔ ۶۰) تو اس کا لسانی پس منظر یہ تھا کہ رحمان کا لفظ عربی نہیں یہ سبائی اور حمیری زبان سے آیا ہے۔ یمن اور حبشہ

سکے نصرانی اللہ کو رحمٰن کہتے تھے۔ قرآن نے اس لفظ کی تعریب کرکے اس کو اللہ کے لئے استعمال کیا تو مکہ والوں کو وہ اجنبی محسوس ہوا۔ انھوں نے کہا "رحمان کیا"۔ قرآن میں غیر عربی الاصل الفاظ ایک سو سے زیادہ شمار کئے گئے ہیں جو فارسی رومی، نبطی، حبشی، عبرانی، سریانی قبطی زبانوں سے لئے گئے ہیں۔

قرآن اگرچہ قریش کی زبان میں اترا۔ مگر دوسرے قبائل عرب کی زبان بھی اس میں شامل کی گئی۔ مثلاً قرآن میں "فاطر" کا لفظ آیا ہے، عبداللہ بن عباسؓ جو ایک قریشی مسلمان تھے۔ کہتے ہیں:

ماکنت ادری معنی (فاطر السماوات والارض) حتی سمعت اعرابیا یقول لبئر ابتدأ حفرها: انا فطرتها

میں فاطر السماوات والارض کے معنی نہیں سمجھتا تھا یہاں تک کہ ایک اعرابی جس نے ایک کنواں کھودنا شروع کیا تھا، کہا' انا فطرتہا۔ تب میں اس کو سمجھا۔

ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں:

ماسمعت السکین الا فی قولہ تعالیٰ (یوسف - ۳۱) ماکنا نقول الا المدیۃ

میں نے سکین (چھری) کا لفظ پہلی بار قرآن کی آیت سے جانا۔ اس سے پہلے ہم اس کو مدیۃ کہا کرتے تھے۔

بہت سے الفاظ ایسے تھے جن کے مختلف لہجے عرب قبائل میں رائج تھے۔ قرآن نے ان میں سے فصیح تر لفظ کا کا انتخاب کرکے اس کو اپنے ادب میں استعمال کیا۔ مثلاً قریش کے یہاں جس مفہوم کے لئے اعطیٰ کا لفظ تھا اس کے لئے حمیرین کے یہاں انطیٰ بولا جاتا تھا۔ قرآن نے انطیٰ کو چھوڑ کر اعطیٰ کا انتخاب کیا۔ اسی طرح شناتر کی جگہ اصابع کتع کی جگہ ذئب وغیرہ۔ قرآن اصلاً قریش کی زبان میں اترا ہے۔ مگر بعض مقامات پر قریش کی زبان کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر لا یلتکم من اعمالکم بنی عبس کی زبان ہے۔ (الاتقان)

اس طرح قرآن نے الفاظ اور اسالیب کو نئی وسعتیں اور نیا حسن دے کر ایک اعلیٰ عربی ادب کا نمونہ قائم کردیا۔ یہ نمونہ اتنا بلند تھا کہ اس کے بعد کوئی ادیب اس سے برتر معیار پیش نہ کرسکا۔ اس لئے عربی زبان ہمیشہ کے لئے قرآن کی زبان ہوکر رہ گئی۔

عربوں میں جو امثال اور تعبیرات قدیم زمانہ سے رائج تھیں، ان کو قرآن نے زیادہ بہتر پیرایہ میں ادا کیا۔ مثلاً زندگی کی بے ثباتی کو قدیم عربی شاعر نے ان لفظوں میں نظم کیا تھا:

کل ابن انثیٰ وان طالت سلامتہ یوما علیٰ آلۃ حدباء محمول

ہر آدمی خواہ وہ کتنے ہی عرصہ تک صحیح وسالم رہے، ایک دن بہرحال وہ تابوت کے اوپر اٹھایا جائے گا۔

قرآن نے اس تصور کو ان لفظوں میں ادا کیا: كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران — ۱۸۵)

قدیم عرب میں قتل وغارت گری سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اس صورت حال نے چند فقرے پیدا کئے تھے جو اس زمانہ میں فصاحت کا کمال سمجھے جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قتل کا علاج قتل ہے۔ اس تصور کو انھوں نے حسب ذیل مختلف الفاظ میں موزوں کیا تھا:

قَتْلُ الْبَعْضِ اِحْيَاءٌ لِلْجَمِيْعِ	بعض لوگوں کا قتل سب کی زندگی ہے
اَكْثِرُوا الْقَتْلَ لِيَقِلَّ الْقَتْلُ	قتل کی زیادتی کرو تاکہ قتل کم ہو جائے۔
اَلْقَتْلُ اَنْفٰى لِلْقَتْلِ	قتل کو سب سے زیادہ روکنے والی چیز قتل ہے

قرآن نے اس تصور کو ان لفظوں میں ادا کیا: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَّا اُولِي الْاَلْبَابِ (بقرہ ۔ ۱۷۹)

قرآن سے پہلے عربی میں اور دنیا کی تمام زبانوں میں شعر کو بلند مقام حاصل تھا۔ لوگ شعر کے اسلوب میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنا کمال سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس عام روش کو چھوڑ کر نثر کا اسلوب اختیار کیا۔ یہ واقعہ بجائے خود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ ساتویں صدی کی دنیا میں صرف خدائے لم یزل ہی اس بات کو جان سکتا تھا کہ انسانیت کے نام ابدی کتاب بھیجنے کے لئے اسے نثر کا اسلوب اختیار کرنا چاہئے نہ کہ شعر کا، جو مستقبل میں غیر اہم ہو جانے والا ہے۔ اسی طرح پہلے کسی بات کو مبالغہ کے ساتھ کہنا ادب کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے تاریخ ادب میں پہلی بار واقعہ نگاری کو رواج دیا۔ پہلے جنگ اور عاشقی سب سے زیادہ مقبول مضامین تھے۔ قرآن نے اخلاق، قانون، سائنس، نفسیات، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ وغیرہ مضامین کو اپنے اندر شامل کیا۔ پہلے قصہ کہانی میں بات کہی جاتی تھی۔ قرآن نے براہ راست اسلوب کو اختیار کیا۔ پہلے قیاسی منطق کو ثبوت کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا، قرآن نے علمی استدلال کی حقیقت سے دنیا کو باخبر کیا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ساری چیزیں قرآن میں اتنے بلند اسلوب کلام میں بیان ہوئیں کہ اس کے مثل کوئی کلام پیش کرنا انسان کے امکان سے باہر ہے۔

قدیم عرب میں یہ مقولہ تھا کہ ان اعذب الشعر اکذبہ (سب سے زیادہ میٹھا شعر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو) مگر قرآن نے ایک نیا طرز بیان (رحمن ۔ ۴) پیدا کیا جس میں فرضی مبالغوں کے بجائے واقعیت تھی، اس نے حقیقت پسند ادب کا نمونہ پیش کیا۔ قرآن عربی زبان و ادب کا حاکم بن گیا۔ ادب جاہلی کا جو سرمایہ آج محفوظ ہے، وہ سب قرآن کی زبان کو محفوظ رکھنے اور اس کو سمجھنے کے لئے جمع کیا گیا۔ اسی طرح صرف ونحو، معانی بیان، لغت وتفسیر، حدیث وفقہ، علم کلام، سب قرآن کے معانی ومطالب کو حل کرنے اور اس کے اوامر و نواہی کی شرح کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ حتیٰ کہ عربوں نے جب تاریخ وجغرافیہ اور دیگر علوم کو اپنایا تو وہ بھی قرآن کے احکام وہدایت کو سمجھنے اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی ایک کوشش تھی —— قرآن کے سوا تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں کہ کسی ایک کتاب نے کسی قوم کو اتنا زیادہ متاثر کیا ہو۔

قرآن نے عربی زبان میں تصرف کرکے جو اعلیٰ تر ادب تیار کیا، وہ اتنا ممتاز اور بدیہی ہے کہ کوئی بھی عربی جاننے والا شخص کسی بھی دوسری عربی کتاب کی زبان سے قرآن کی زبان کا تقابل کرکے ہر وقت اسے دیکھ سکتا ہے۔ قرآن کا [illegible] ادب عام انسانی ادب سے اتنا نمایاں طور پر فائق ہے کہ کوئی عربی داں اس کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہاں ہم مثال کے لئے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے اس فرق کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ طنطاوی جوہری لکھتے ہیں:

۱۳ جون ۱۹۳۲ کو میری ملاقات مصری ادیب استاذ کامل گیلانی سے ہوئی۔ انھوں نے ایک عجیب واقعہ

بیان کیا۔ انھوں نے کہا میں امریکی مستشرق فنکل کے ساتھ تھا۔ میرے اور ان کے درمیان ادبی رشتہ سے گہرے تعلقات تھے۔ ایک دن انھوں نے میرے کان میں چپکے سے کہا "کیا تم بھی انھیں لوگوں میں ہو جو قرآن کو ایک معجزہ مانتے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ ایک معنی خیز ہنسی ہنسے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس عقیدہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ محض تقلیداً مسلمان اس کو مانتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے ایسا تیر مارا ہے جس کا کوئی روک نہیں۔ ان کا یہ حال دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ میں نے کہا: قرآن کی بلاغت کے بارے میں کوئی حکم لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ کیا ہم اس جیسا کلام مرتب کر سکتے ہیں۔ تجربہ کر کے خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ ہم ویسا کلام تیار کرنے پر قادر ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد میں نے استاذ فنکل سے کہا کہ آیئے ہم ایک قرآنی تصور کو عربی الفاظ میں مرتب کریں۔ وہ تصور یہ کہ "جہنم بہت وسیع ہے"۔ انھوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ہم دونوں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں نے مل کر "تقریباً بیس جملے عربی کے بنائے جس میں مذکورہ بالا مفہوم کو مختلف الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ جملے یہ تھے:

ان جهنم لواسعة جدا
ان جهنم لاوسع مما تظنون
ان سعة جهنم لا يتصورها عقل الانسان
ان جهنم لتسع الدنيا كلها
ان الجن والانس اذا دخلوا جهنم لتسعهم ولا تضيق بهم
كل وصف فى سعة جهنم لا يصل الى تقريب شئ من حقيقتها
ان سعة جهنم لتصغر امامها سعة السماوات والارض
كل ما خطر بالك فى سعة جهنم فانها لارحب منه واوسع
ستردون من سعة جهنم ما لم تكونوا لتحلموا به او تتصوروه
مهما حاولت ان تتخيل سعة جهنم فانت مقصر ولن تصل الى شئ من حقيقتها
ان البلاغة المعجزة لتقصر وتعجز اشد العجز عن وصف سعة جهنم
ان سعة جهنم قد تخطت احلام الحالمين وتصور المتصورين
متى امسكت بالقلم وتصديت لوصف سعة جهنم احسست بقصورك وعجزك
ان سعة جهنم لا يصفها وصف ولا يتخيلها وهم ولا تدور بحسبان
كل وصف لسعة جهنم انما هو فضول وهذيان

ہم دونوں جب اپنی کوشش مکمل کر چکے اور ہمارے پاس مزید عبارت کے لئے الفاظ نہ رہے تو میں نے

پروفیسر فنکل کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ "اب آپ پر قرآن کی بلاغت کھل جائے گی"۔ میں نے کہا "جب کہ ہم اپنی ساری کوشش صرف کرکے اس مفہوم کے لئے اپنی عبارتیں تیار کر چکے ہیں۔ پروفیسر فنکل نے کہا: کیا قرآن نے اس مفہوم کو ہم سے زیادہ بلیغ اسلوب میں ادا کیا ہے۔ میں نے کہا ہم قرآن کے مقابلے میں بچے ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا، قرآن میں کیا ہے۔ میں نے سورہ ق کی یہ آیت پڑھی: يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ۔ یہ سن کر ان کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس بلاغت کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انھوں نے کہا:

صدقت نعم صدقت وانا اقر بذلك مغتبطا من كل قلبي۔

آپ نے سچ کہا بالکل سچ۔ میں کھلے دل سے اس کا اقرار کرتا ہوں۔

میں نے کہا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آپ نے حق کا اعتراف کر لیا۔ کیوں کہ آپ ادیب ہیں اور اسالیب کی اہمیت کا آپ کو پورا اندازہ ہے۔ یہ مستشرق انگریزی، جرمن، عبرانی اور عربی زبانوں سے بخوبی واقف تھا۔ لٹریچر کے مطالعہ میں اس نے اپنی عمر صرف کر دی تھی۔

الشیخ طنطاوی جوہری، الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، مصر ۱۳۵۱ھ، جزء ۲۳، صفحات ۱۲-۱۱۱

نظریاتی طاقت

انجیل میں پیغمبر اسلام کے بارے میں جو پیشین گوئیاں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

ومن فمه يخرج سيف ماض لكي يضرب به الامم

قوموں کو مارنے کے لئے اس کے منھ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے

یوحنا عارف کا مکاشفہ ۱۹ : ۱۵

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کو جو دین دیا جائے گا اس کی طاقت لوہے کی تلوار نہیں ہو گی بلکہ الفاظ کی تلوار ہو گی۔ وہ نظریاتی طاقت سے قوموں کو زیر کرے گا۔ وہ اس قوت کے ذریعہ کام کرے گا جو زبان سے نکلتی ہے نہ کہ وہ قوت جو کانوں سے اور زمین کی تہوں سے برآمد ہوتی ہے۔

یہ ایک عظیم الشان پیشین گوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری رسول کے ذریعہ جو دین دیا گیا ہے، اس کے حاملین کے لئے کبھی نہتا یا بے وسیلہ ہونے کا سوال نہیں۔ وہ اس وقت بھی، امکانی طور پر، اعلیٰ ترین طاقت سے مسلح ہوں گے جبکہ ہر قسم کی ظاہری طاقتیں ان سے چھن چکی ہوں گی۔ کیونکہ ان کی طاقت کا راز ان کے دین کی نظریاتی صداقت میں ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کو ان سے کوئی چھین نہیں سکتا۔

یہ پیشین گوئی پیغمبر اسلام کی زندگی میں اپنی مکمل شکل میں پوری ہو چکی ہے۔ آپ کی زبان پر اللہ نے اپنا جو کلام جاری کیا، اس نے قدیم آباد دنیا کے تقریباً پورے علاقہ کو زیر و زبر کر ڈالا۔ کلام الٰہی کی یہ طاقت آج بھی اپنا کرشمہ دکھا سکتی ہے، بشرطیکہ پیغمبر اسلام کے امتی اس کو لے کر اسی طرح اٹھیں جس طرح ان کے پیش رو اس کو لے کر اٹھے تھے۔

یہی حقیقت حدیث میں ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:

ان الله يرفع بهذا القرآن اقواما ويضع به آخرين

اللہ اس کتاب کے ذریعہ کچھ لوگوں کو بلند کرے گا اور کچھ لوگوں کو اس کے ذریعہ سے پست کرے گا۔

شرعی قانون کی حکمتیں

اسلامی قانون میں چور کے لیے یہ سزا رکھی گئی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تاکہ آئندہ لوگ اس کے شر سے محفوظ ہو جائیں اور اس کے انجام کو دیکھ کر دوسروں کو سبق حاصل ہو۔ (مائدہ - ۳۸) اس کے بارہ میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک بے رحمانہ قانون ہے۔ کسی معاشرہ میں اس پر عمل کیا جائے تو وہاں بے شمار لوگ بے ہاتھ ہو جائیں گے اور پورا معاشرہ بے کار معاشرہ بن کر رہ جائے گا۔ مگر یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ میڈیکل سائنس کا یہ نظریہ غلط ہے کہ کسی عضو میں سپٹک ہو جائے تو اس کو فوراً کاٹ دینا چاہیے۔ میڈیکل سائنس کے اس نظریہ کے عملی رواج کے باوجود اگر تمام لوگ بغیر ہاتھ پاؤں کے نہیں ہو گئے ہیں تو چوری کے بارہ میں اسلامی قانون کی وجہ سے لوگ بے ہاتھ کیوں ہو جائیں گے۔

یہ کوئی فرضی بات نہیں ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ اس قانون کو نافذ کیا گیا، دور نبوت سے لے کر خلافت راشدہ کے خاتمہ تک صرف چھ آدمیوں کے ہاتھ کاٹے گئے اور ساری مسلم سلطنت میں امن قائم ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں سعودی عرب میں یہ قانون نافذ ہے۔ مگر برسوں گزر جاتے ہیں اور ایک ہاتھ کاٹنے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ قانون اپنے اندر چوری کو روکنے کی خاصیت (DETERRENT VALUE) رکھتا ہے۔ قطع ید کے حکم کا مطلب ہاتھ کاٹنے سے زیادہ یہ ہے کہ لوگوں میں دہشت پیدا ہو جائے اور کوئی شخص چوری کرنے کی ہمت ہی نہ کرے۔ یہ فائدہ اسلام کے قانونی نظام میں پہلے بھی حاصل ہوا اور آج بھی حاصل ہو رہا ہے۔

معاشرہ کو بے کار کرنے کا اعتراض زیادہ صحیح طور پر موجودہ قوانین پر عاید ہوتا ہے۔ ان قوانین میں چوری کی ہلکی سزا ہونے کی وجہ سے مجرموں کی حوصلہ شکنی نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ چوری کی وارداتیں بے حد بڑھ جاتی ہیں اور بے شمار لوگ چوری کے جرم میں پکڑ کر قید میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح ہزاروں لوگوں کو عمل کے میدان سے ہٹا کر ان کو قوم کے اوپر بوجھ بنا دیا جاتا ہے۔ جب کہ شریعت کے مطابق چند آدمیوں کا ہاتھ کاٹ کر ہمیشہ کے لئے امن کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتے ہیں۔ نتیجۃً سماج کے عمل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چند لوگوں کو سخت سزا دے کر سارے معاشرہ کو مستقل طور پر تحفظ کا احساس دے دیا جائے، یہ اس سے بہتر ہے کہ چند لوگوں کی خاطر مستقل طور پر معاشرہ سے تحفظ کا احساس ختم کر دیا جائے۔

یورپ اور امریکہ کے حالات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کیا ہے کہ مادی فراوانی سے چوری خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں چوری کے واقعات غیر ترقی یافتہ ملکوں سے کم نہیں ہیں۔ البتہ شکلیں مختلف ہیں۔ پس ماندہ ملک کا ایک شخص دیہاتی چودھری کے مکان میں نقب لگاتا ہے اور امریکہ میں وہ بنک کے اوپر ڈاکہ ڈالتا ہے۔

قطع ید کی سزا نہ صرف سماج کو امن کی ضمانت دیتی ہے بلکہ ایک چور کا ہاتھ کاٹنا بہت سے لوگوں کو اس انجام سے بچاتا ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں انتہائی بے رحمی کے ساتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ چور اور ڈاکو جب کسی کا مال لوٹنے آتے ہیں تو وہ صرف مال نہیں لوٹتے، بلکہ صاحب مال پر بھی حملہ کرتے ہیں اور کبھی ان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں، کبھی ناکارہ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چور کے ہاتھ

نہ کاٹے جائیں تب بھی لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹتے رہیں گے اور دوسری صورت میں کٹنے کی تعداد یقینی طور پر پہلی صورت سے کہیں زیادہ ہوگی جیسا کہ دنیا بھر کے تجربہ سے ثابت ہوا ہے۔

قطع ید کے حکم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس "چوری" کی واردات ہوئی اور فوراً آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ انسانی زندگی میں کوئی واقعہ بے شمار عوامل کے تحت ہوتا ہے اس لئے کسی متعین واقعہ پر حکم لگانے کے لئے سارے پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ حتیٰ کہ شریعت کا منشا یہ ہے کہ ایک قاضی کا معاف کرنے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے۔

چوری کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مجرمانہ ذہنیت کے تحت کی جاتی ہے دوسری وہ جو ضرورتاً کسی سے کبھی صادر ہو جاتی ہے۔ دوسری قسم کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ مثلاً بھوک سے چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح باپ کا بیٹے کے مال سے یا بیٹے کا باپ کے مال سے لینے پر بھی نہیں۔ نابالغ اور غیر عاقل کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح اور بہت سی صورتیں ہیں جن میں چوری کا واقعہ ہونے کے باوجود ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔

اسلام میں انسان کا اور اس کے "ہاتھ" کا جتنا احترام ہے کسی بھی دوسرے نظام میں اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص ظلماً کسی کا ہاتھ کاٹ دے تو اس کو ایک انسان کے قتل کی دیت کا نصف (پچاس اونٹ) مقطوع الید کو دینا پڑتا ہے۔ پیغمبر اسلام کے پاس ایک بار ایک دیہاتی آیا، سلام کے بعد آپ نے اس سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے معذرت کی اور کہا کہ میرا ہاتھ موٹا کام کرنے کی وجہ سے سخت و درشت ہو گیا ہے۔ آپ نے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو چوم لیا اور فرمایا: جو ہاتھ محنت کی کمائی سے سخت ہو جائے، اس ہاتھ کو اللہ اور رسول بہت پسند کرتے ہیں۔

بطرس بن بولس بستانی مارونی (۱۸۸۳ - ۱۸۱۹) بستان کا ایک عیسائی عالم تھا۔ وہ عربی، سریانی، لاطینی، اطالوی، انگریزی، عبرانی، یونانی زبانیں جانتا تھا۔ فلسفہ، علم الہیات، قانون، تاریخ، جغرافیہ اور حساب کی تعلیم حاصل کی۔ اس نے امریکی عیسائیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ مل کر تورات کا ترجمہ کیا۔ المدرسۃ الوطنیہ کے نام سے ایک اسکول قائم کیا۔ یہ مدرسہ اتنا مقبول ہوا کہ شام، مصر، آستانہ، یونان اور عراق تک کے طلبہ اس میں تحصیل علم کے لئے آتے تھے۔ اس نے قاموس المحیط کے نام سے جدید طرز کا عربی لغت لکھا۔ قطر المحیط کے نام سے ایک انسائیکلوپیڈیا لکھنی شروع کی۔ چھ جلدیں شائع کر سکا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے لڑکے سلیم نے ساتویں اور آٹھویں جلدیں شائع کیں۔ نویں جلد کو ترتیب دیتے ہوئے اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرے بیٹوں نے نویں جلد مکمل کی۔ اس کے بعد بطرس بستانی کے بھائی سلیمان بستانی نے دسواں اور گیارھواں حصہ لکھا۔

ایک نام کو پشت در پشت آگے بڑھانے کا یہ طریقہ اس کی کامیابی کی سب سے زیادہ یقینی ضمانت ہے۔

پیغمبر اسلام

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو ہم دو بڑے دوروں میں بانٹ سکتے ہیں۔ ایک نبوت سے پہلے۔ دوسرا نبوت ملنے کے بعد۔ آپ اپنی زندگی کے دونوں دوروں میں خدا کے کامل بندے اور اس کی طرف پوری طرح رجوع کرنے والے نظر آتے ہیں۔ نبوت سے پہلے آپ کی عبدیت سچی تلاش حق کی صورت میں ظاہر ہوئی اور نبوت کے بعد سچی اتباع حق کی صورت میں۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو عرب میں پیدا ہوئے اور ۸ جون ۶۳۲ء کو آپ کی وفات ہوئی۔ آپؐ نہایت تندرست اور طاقت ور تھے۔ بچپن سے یہ حال تھا کہ جو دیکھتا کہہ اٹھتا: ان لہذا الغلام لشأنا۔ بڑے ہوئے تو آپؐ کی شخصیت اور زیادہ نمایاں ہوگئی۔ آپ کو دیکھنے والے آپ سے مرعوب ہو جاتے۔ اسی کے ساتھ اتنے نرم اور شیریں زبان تھے کہ تھوڑی دیر بھی جو شخص آپ کے قریب رہتا، آپ سے محبت کرنے لگتا۔ برداشت، سچائی، معاملہ فہمی، حسن سلوک آپ کے اندر کامل درجہ میں پایا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ آپ اس انسانی بلندی کی اعلیٰ ترین مثال تھے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبداللہ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپ اپنی قوم میں سب سے زیادہ با اخلاق، پڑوسیوں کی خبرگیری کرنے والے، حلیم و بردبار، صادق و امین جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش گوئی و دشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کی قوم نے آپ کا نام "الامین" رکھا تھا (خصائص کبریٰ، جلد ۱، صفحہ ۹۱)

۲۵ سال کی عمر میں جب آپ نے شادی کی تو اس موقع پر آپ کے چچا ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھتے ہوئے کہا تھا:

ان ابن اخی محمد ابن عبد اللہ لا یوزن بہ رجل الا رجح بہ شرفا ونبلا وفضلا وعقلا، وھو واللہ بعد ھذا لہ نبأ عظیم وخطر جلیل

میرے بھتیجے محمد بن عبداللہ کا مقابلہ جس شخص سے بھی کیا جائے، وہ شرافت، نجابت، بزرگی اور عقل میں اس سے بڑھ جائے گا۔ خدا کی قسم اس کا مستقبل عظیم ہوگا، اور اس کا رتبہ بلند ہوگا۔

ابو طالب نے یہ الفاظ ان معنوں میں نہیں کہے تھے جن معنوں میں بعد کو تاریخ نے اسے سچا ثابت کیا۔ انھوں نے یہ بات تمام تر دنیوی معنوں میں کہی تھی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص فطرت سے وہ پر کشش شخصیت لے کر پیدا ہوا ہو، جو محمد بن عبداللہ میں نظر آتی ہے، وہ بہرحال قوم کے اندر معزز مقام حاصل کرتا ہے اور دنیا کے بازار میں اس کی بڑی قیمت مل کر رہتی ہے۔ ایسے شخص کی اعلیٰ صلاحیتیں اس کی ترقی اور کامیابی کی یقینی ضمانت ہیں۔

پیغمبر اسلام کے لئے یہ امکانات، بلاشبہ، پوری طرح موجود تھے۔ آپ اپنی صلاحیتوں کی بڑی سے بڑی دنیوی قیمت وصول کر سکتے تھے۔ آپ مکہ کے ایک اونچے خاندان میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ آپ کو اپنے باپ سے وراثت میں صرف

ایک اونٹنی اور ایک خادمہ ملی تھی۔ مگر آپ کی شاندار پیدائشی خصوصیات نے مکہ کی سب سے امیر خاتون کو متاثر کیا۔ ۲۵ سال کی عمر میں ان سے آپ کا نکاح ہوگیا۔ یہ ایک تاجر خاندان کی بیوہ تھیں۔ ان سے آپ کو نہ صرف مال اور جائداد ملی، بلکہ عرب میں اور عرب کے باہر تجارت کا زبردست میدان بھی ہاتھ آیا۔ اب آپ کے لئے ایک پُرسکون اور کامیاب زندگی بنانے کے سارے مواقع فراہم ہو چکے تھے۔ مگر آپ نے ان کو چھوڑ کر ایک اور ہی چیز کا انتخاب کیا۔ آپ نے جانتے بوجھتے اپنے کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیا جو صرف دنیا کی بربادی کی طرف لے جاتی تھی۔ خدیجہ سے نکاح سے پہلے آپ اپنی گزر اوقات کے لیے کچھ معاشی کام کر لیتے تھے۔ اب وہ بھی چھوٹ گیا، اب آپ ہمہ تن اس تلاش میں لگ گئے جس کی جستجو آپ کو بچپن سے تھی۔ یہ کہ سچائی کیا ہے۔ آپ گھنٹوں بیٹھے ہوئے زمین و آسمان پر غور کرتے رہتے۔ مکہ کے شرفاء میں اپنے تعلقات بڑھانے اور وہاں کی مجلسوں میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ صحراؤں اور پہاڑوں کو اپنا ہم نشین بنالیا۔ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس میں ایک کھوہ ہے جس کا نام حرا ہے۔ آپ ستو اور پانی لے کر وہاں چلے جاتے۔ پہاڑ کے سنسان ماحول میں زندگی کی حقیقت پر غور کرتے۔ زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے سے دعائیں مانگتے کہ میرے رب! تو اپنے آپ کو میرے اوپر ظاہر کردے۔ سچائی کیا ہے، مجھ کو بتادے۔ جب پانی کی مشک خالی ہو جاتی اور ستو ختم ہو جاتے تو گھر واپس آتے تاکہ دوبارہ اسی طرح کھانے پینے کا سامان لے کر قدرت کے اس ماحول میں لوٹ جائیں جہاں صحرا اور درخت تھے۔ پہاڑ اور آسمان کی پرسکون فضائیں تھیں۔ آپ کی بے چین طبیعت انسانی ہنگاموں میں اپنے سوال کا جواب نہ پاسکی تھی۔ اب آپ نے قدرت کی خاموش دنیا کو اپنا ہم نشین بنایا تھا کہ شاید وہ اس کا کچھ جواب دے سکے۔

جوانی کی طاقتوں سے بھرپور ایک شخص کے لئے اس قسم کی زندگی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ خوشی کے راستہ کو چھوڑ کر غم کے راستہ کو اپنانا تھا۔ بیوی بچوں کے ساتھ آرام کی زندگی گزارنا، تجارت کو ترقی دینا اور سوسائٹی میں اپنی جگہ بنانا، یہ تمام امکانات آپ کے لئے پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ مگر آپ کی بے تاب اور متلاشی طبیعت ان چیزوں پر راضی ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ تمام چیزیں اس وقت تک آپ کو ہیچ معلوم ہوتی تھیں جب تک آپ زندگی کا راز معلوم نہ کرلیں۔ آپ جاننا چاہتے تھے کہ ان ظاہری چیزوں سے اوپر اگر کوئی حقیقت ہے تو وہ کیا ہے۔ نفع نقصان اور آرام و تکلیف کی اصطلاحوں میں سوچنے کے بجائے آپ اس سوال کو حل کرنے میں منہمک رہتے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔

پیغمبر اسلام کی زندگی کا یہی وہ پہلو ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى (والضحیٰ) ضال کے معنی ہیں راہ بھولا ہوا، سرگرداں۔ (ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ضل فی شعاب مكة وهو صغير ثم رجع) یہ لفظ اس مسافر کے لئے بولا جاتا ہے جو راستہ سے بھٹک گیا ہو اور حیران و پریشان مختلف راستوں کو دیکھ رہا ہو، اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کدھر جائے۔ اسی لئے اس درخت کو ضالہ کہتے ہیں جو صحرا میں اکیلا کھڑا ہو اور اس کے آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو۔ اسی سے کہا جاتا ہے ضل الماء فی اللبن (پانی دودھ میں کھوگیا) آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ جاہلیت کے بیابان میں اکیلے درخت کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ صحراؤں اور پہاڑوں میں یہ غم لئے پھرتے تھے کہ سچائی کیا ہے جس کو میں اپناؤں۔ دنیا کے مروجہ نقشوں میں اپنی جگہ بنانے کے بجائے حیران و متفکر ہو کر الگ تھلگ

جا پڑے تھے۔ سچائی سے کمتر کوئی چیز آپ کی روح کے لیے تسکین کا ذریعہ نہیں بن سکتی تھی۔ حتیٰ کہ آپ کی تلاش حق کی سرگردانی اس نوبت کو پہنچ گئی تھی کہ زندگی آپ کے لئے ایک ایسا بوجھ بن گئی جو آپ کی کمر توڑے دے رہی تھی۔ (الم نشرح)

اس وقت اللہ کی رحمت آپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ آپ کے لئے ہدایت اور روشنی کے دروازے کھول دیے گئے۔ ۱۲ فروری ۶۱۰ء کو جب کہ آپ حرا میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے، خدا کا فرشتہ انسان کی صورت میں آپ کے سامنے ظاہر ہوا اور خدا کی طرف سے آپ کو وہ کلمات سکھائے جو قرآن کی سورہ نمبر ۹۶ کی ابتدا میں درج ہیں۔ آپ کی تلاش نے بالآخر اپنا جواب پا لیا۔

پیغمبر اسلام کی بے چین روح کا ربط رب العالمین سے قائم ہو گیا۔ خدا نے آپ کو نہ صرف ہدایت دی بلکہ اپنے نمائندہ خاص کی حیثیت سے چن لیا۔ آپ کے اوپر خدا کا کلام اترنے لگا۔ آپ کی نبوت کی یہ مدت ۲۳ سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس مدت میں خدا کی کتاب (قرآن) مکمل طور پر آپ کے اوپر اتاری گئی۔

پیغمبر اسلام نے اپنی مشکل زندگی کے چالیسویں سال میں سچائی دریافت کر لی۔ مگر یہ سچائی آپ کے لئے کوئی آسان سودا نہ تھی۔ اس سچائی کا مطلب یہ تھا کہ آدمی ایک عظیم تر خدا کی زد میں ہے۔ یہ اپنے عجز کے مقابلہ میں خدا کی کبریائی کی دریافت تھی، یہ خدا کے اثبات کے مقابلہ میں اپنی نفی کا پتہ لگانا تھا۔ یہ اس راز کو معلوم کرنا تھا کہ اس دنیا میں بندۂ مومن کی صرف ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں، یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے۔

سچائی کی دریافت کے بعد پیغمبر اسلام کے لیے، زندگی کے معنے کیا تھے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں یہ صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ آپ نے ایک بار فرمایا:

امرنی ربی بتسع	میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے
خشیۃ اللہ فی السر والعلانیۃ	کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں
وکلمۃ العدل فی الغضب والرضا	غصہ میں ہوں یا خوشی میں، ہمیشہ انصاف کی بات کروں
والقصد فی الفقر والغنا	محتاجی اور امیری دونوں حالتوں میں اعتدال پر قائم رہوں
وان اصل من قطعنی	جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں
واعطی من حرمنی	جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں
واعفو من ظلمنی	جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں
وان یکون صمتی فکرا	اور میری خاموشی غور وفکر کی خاموشی ہو
ونطقی ذکرا	میرا بولنا یاد الٰہی کا بولنا ہو۔
ونظری عبرۃ (رواہ رزین)	میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو

یہ محض تقریر یا گفتگو کے الفاظ نہ تھے۔ یہ خود آپ کی زندگی تھی جو لفظوں کی صورت میں ڈھل رہی تھی۔ یہ حیرت انگیز حد تک موثر کلمات اور اس قدر بہنچی ہوئی باتیں ایک خالی انسان کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتیں۔ یہ الفاظ تو خود بولنے والے

کا مقام بتا رہے ہیں۔ وہ کہنے والے کے اندرون کو انڈیل رہے ہیں۔ وہ بولنے والے کی روح کو الفاظ کے آئینہ میں بے نقاب کر رہے ہیں۔

آپ کی زندگی اگرچہ نبوت ملنے سے پہلے بھی اسی قسم کی تھی، مگر وہ تمام تر فطرت کے زور پر تھی۔ اب سچائی کی دریافت نے اس کو شعور کا درجہ دے دیا۔ جو کردار اب تک طبعی تقاضے کے تحت ظاہر ہوتا تھا، اب وہ ایک سوچے سمجھے ذہن کا ارادی جزو بن گیا۔ یہ کسی بندۂ خدا کا وہ مقام ہے جہاں دنیوی تقاضے انتہائی حد تک گھٹ کر صرف بقدر حاجت رہ جاتے ہیں۔ آدمی کی جینے کی سطح عام انسانوں سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اس کا جسم اسی ظاہری دنیا میں ہوتا ہے مگر نفسیاتی اعتبار سے وہ ایک اور دنیا میں زندگی گزارنے لگتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام نے فرمایا:

وعلی العاقل مالم یکن مغلوبا علی عقلہ ان یکون لہ ساعات
ساعۃ یناجی فیہا ربہ
وساعۃ یحاسب فیہا نفسہ
وساعۃ یتفکر فیہا فی صنع اللہ
وساعۃ یخلو فیہا لحاجتہ من المطعم والمشرب
رواہ ابن حبان فی صحیحہ والحاکم
وقال صحیح الاسناد عن ابی ذر الغفاری)

عقلمند شخص کے لئے لازم ہے کہ اس پر کچھ گھڑیاں گزریں
ایسی گھڑی جب کہ وہ اپنے رب سے باتیں کرے،
ایسی گھڑی جب کہ وہ اپنی ذات کا محاسبہ کرے،
ایسی گھڑی جب کہ وہ خدا کی تخلیق میں غور کر رہا ہو۔
اور ایسی گھڑی جب کہ وہ کھانے پینے کی ضرورتوں کے لئے وقت نکالے۔

گویا خدا کا وفادار بندہ وہ ہے جس کے روز و شب کے لمحات اس طرح گزریں کہ کبھی اس کی بے قراریاں اس کو خدا سے اتنا قریب کر دیں کہ وہ اپنے رب سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ کبھی یوم الحساب میں کھڑے ہونے کا خوف اس پر اس طرح طاری ہو کہ وہ دنیا ہی میں اپنا حساب کرنے لگے۔ کبھی کائنات میں خدا کی کاریگری کو دیکھ کر وہ اس میں اتنا محو ہو کہ اس کے اندر اس کو خالق کے جلوے نظر آنے لگیں۔ اس طرح گویا خدا سے ملاقات، اپنے آپ سے ملاقات اور کائنات سے ملاقات میں اس کے لمحات گزر رہے ہوں۔ اور بدرجہ حاجت وہ کسی وقت کھانے پینے کے لئے بھی اپنے کو فارغ کر لیا کرے۔

یہ الفاظ دور کے کسی انسان کا تعارف نہیں ہیں۔ اس میں خود پیغمبر اسلام کی اپنی شخصیت بول رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ظاہری جسم کے اندر جو مومنانہ روح تھی اس میں ہر وقت کس قسم کے طوفان اٹھتے رہتے تھے۔ آپ کی زندگی کس قسم کی "ساعات" کے درمیان گزر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص خود ان گھڑیوں کا تجربہ نہ کر رہا ہو، وہ کبھی اتنے اعلیٰ الفاظ میں اس بات کو بیان ہی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک ایسی روح سے نکلے ہوئے کلمات ہیں جس نے ان کیفیات کو خود کمال درجہ میں پایا تھا جن کو وہ لفظوں کے ذریعہ دوسروں پر کھول رہا تھا۔

پیغمبر اسلام کو، وحی خداوندی ملنے سے پہلے، موجودہ دنیا اپنی کمیوں اور محدودیتوں کے ساتھ بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ مگر جب آپ پر خدا نے اس حقیقت کو کھولا کہ اس دنیا کے سوا ایک اور دنیا ہے جو کامل اور ابدی ہے اور وہی

انسان کی اصلی قیام گاہ ہے، تو زندگی اور کائنات دونوں آپ کے لیے بامعنی ہو گئے۔ اب آپ نے زندگی کی وہ سطح پالی جہاں آپ جی سکتے تھے، جس میں آپ اپنا دل لگا سکتے تھے۔ اب آپ کو ایک ایسی حقیقی دنیا مل گئی جس سے اپنی امیدوں اور تمناؤں کو وابستہ کر سکیں جس کے پیش نظر اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کریں۔

یہی مطلب ہے الدنیا مزرعة الآخرة (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو آج کل کی اصطلاح میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہا جا سکتا ہے۔ ایسا آدمی، اپنے تصور حیات کے لازمی نتیجہ کے طور پر، آخرت کو اپنا اصلی مسئلہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اس سے باخبر ہو جاتا ہے کہ دنیا ہماری منزل نہیں۔ وہ صرف راستہ ہے۔ وہ آخرت کے مستقبل کی تیاری کا ایک ابتدائی مرحلہ ہے۔ جس طرح ایک دنیا پرست آدمی کی تمام سرگرمیاں دنیوی مصالح کے گرد گھومتی ہیں، اسی طرح ایک بندہ خدا کی پوری زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہو جاتا ہے۔ ہر معاملہ میں اس کا رویہ اس فکر کے تحت بنتا ہے کہ آخرت میں اس کا انجام کیا ہوگا۔ خوشی ہو یا غم، کامیابی ہو یا ناکامی، زبردستی کی حالت ہو یا زور آوری کی، تعریف کی جا رہی ہو یا تنقید، غصہ کا موقع ہو یا محبت کا، ہر حال میں آخرت کا خیال اس کا رہنما بنا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ آخرت کا فکر اس کے لاشعور کا جزء بن جاتا ہے۔ اگرچہ اب بھی وہ بشریت سے خالی نہیں ہوتا۔ مگر اس کا ذہن انھیں امور میں چلتا ہے جو آخرت سے تعلق رکھنے والے ہوں۔ جن باتوں میں آخرت کا کوئی پہلو نہ ہو ان سے اس کی دلچسپیاں اتنی کم ہو جاتی ہیں کہ بعض اوقات اس کو کہنا پڑتا ہے: انتم اعلم بامور دنیاکم (تم اپنے دنیا کے معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو)

اس حقیقت کی حیثیت محض ایک علمی دریافت کی نہیں۔ اس کو پانے کے بعد آدمی کی جینے کی سطح بدل جاتی ہے۔ آدمی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ اس کی بہتر مثال خود پیغمبر اسلام کی ذات ہے۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ جب تک جینے کی سطح نہ بدلے، عمل کی سطح نہیں بدل سکتی۔

پیغمبر اسلام نے جب یہ حقیقت پائی تو وہ ان کی پوری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔ جس جنت کی خبر آپ دوسروں کو دے رہے تھے، اس کے آپ خود سب سے زیادہ حریص بن گئے اور جس جہنم سے دوسروں کو ڈرا رہے تھے، اس سے آپ خود سب سے زیادہ ڈرنے لگے۔ آپ کا یہ اندرونی طوفان بار بار دعا اور استغفار کی صورت میں آپ کی زبان سے ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ آپ کی جینے کی سطح عام انسانوں سے کس طرح مختلف تھی اس کا اندازہ چند واقعات سے ہوگا۔

عن ام سلمة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان فی بیتها فدعی وصیفة له اولها فابطأت فاستبان الغضب فی وجهه فقامت ام سلمة الی الحجاب فوجدت الوصیفة تلعب ومعه سواك فقال لولا خشیة القود یوم القیامة لاوجعتك بهذا السواك

(الادب المفرد، باب قصاص العبد، صفحہ ۲۹)

ام سلمہ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں تھے آپ نے خادمہ کو بلایا۔ اس نے آنے میں دیر کی۔ آپ کے چہرہ پر غصہ ظاہر ہو گیا۔ ام سلمہ نے پردہ کے پاس جا کر دیکھا تو خادمہ کو کھیلتے ہوئے پایا۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ آپ نے خادمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اگر قیامت کے دن مجھے بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تجھ کو اس مسواک سے مارتا۔

بدر کی جنگ (رمضان ۲ھ) کے بعد جو لوگ قیدی بن کر آئے، وہ آپ کے بدترین دشمن تھے۔ مگر آپ نے ان کے ساتھ بہترین سلوک کیا۔ ان قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا جو آتش بیان خطیب تھا اور تمام مجمعوں میں آپ کے خلاف بیہودہ تقریریں کیا کرتا تھا۔ عمر فاروقؓ نے رائے دی کہ اس کے نیچے کے دو دانت اکھڑوا دیئے جائیں تاکہ آئندہ کے لئے اس کا تقریر کا جوش ختم ہو جائے۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا:

"خدا میرا چہرہ قیامت میں بگاڑ دے گا اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں"

پیغمبر اسلام عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ خوشی کی بات سے آپ کو خوشی ہوتی تھی اور غم کی بات سے آپ غمگین ہوتے تھے۔ مگر آپ کی عبدیت آپ کو خدا کے مقرر کئے ہوئے دائرہ سے باہر نہیں جانے دیتی تھی۔

پیغمبرؐ اسلام کی آخر عمر میں ماریہ قبطیہ سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا خوبصورت اور تندرست تھا۔ اس کا نام آپ نے اپنے بزرگ ترین جد امجد کے نام پر ابراہیم رکھا۔ ابو رافع نے جب ابراہیم کی پیدائش کی خبر دی تو آپ اتنا خوش ہوئے کہ ابو رافع کو ایک غلام انعام میں دے دیا۔ آپ ابراہیم کو گود میں لے کر کھلاتے اور پیار کرتے۔ عرب قاعدہ کے مطابق ابراہیم کو ایک دایہ ام بردہ بنت المنذر بن زید انصاری کے حوالے کیا گیا تاکہ وہ دودھ پلائیں۔ یہ دایہ ایک ایک لوہار کی بیوی تھیں۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں اکثر بھٹی کا دھواں ہوتا رہتا۔ آپ لڑکے کو دیکھنے کے لئے اکثر لوہار کے گھر جاتے اور وہاں دھواں آپ کی آنکھ اور ناک میں گھستا رہتا اور آپ انتہائی نازک طبع ہونے کے باوجود اس کو برداشت کرتے۔ ابراہیم ابھی ڈیڑھ سال کے ہوئے تھے کہ ہجرت کے دسویں سال (جنوری ۶۳۲) ان کا انتقال ہو گیا۔ آپؐ بیٹے کی موت کو دیکھ کر رونے لگے۔

ان واقعات میں پیغمبر اسلام ایک عام انسان کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان کے جذبات، ان کی حسرتیں ویسی ہی ہیں جیسی ایک عام باپ کی ہوتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود خدا کا دامن آپ کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ آپ غم زدہ ہیں مگر زبان سے نکل رہا ہے:

واللہ یا ابراهیم انّا بفراقك لمحزونون، تبکی العین ویحزن القلب ولا نقول ما یسخط الرب	خدا کی قسم اے ابراہیم ہم تمہاری موت سے غمگین ہیں، آنکھ رو رہی ہے، دل دکھی ہے، مگر ہم کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جو رب کو ناپسند ہو۔

جس دن ابراہیم کا انتقال ہوا۔ اتفاق سے اسی دن سورج گرہن پڑا۔ قدیم زمانہ میں اعتقاد تھا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کسی بڑے آدمی کی موت سے ہوا کرتے ہیں۔ اس کے اثر سے مدینہ کے مسلمان کہنے لگے کہ یہ سورج گرہن پیغمبر کے بیٹے کی موت کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ کو یہ بات بہت ناپسند ہوئی۔ کیوں کہ یہ انسان کی عاجزانہ حیثیت کے خلاف تھی۔ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی، آپ نے فرمایا:

ان الشمس والقمر لا ینخسفان لموت احد من الناس ولکنهما آیتان من آیات اللہ، فاذا رأیتموها فصلوا	سورج چاند میں کسی انسان کی موت سے گہن نہیں لگتا۔ وہ اللہ کی دو نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔ جب تم ایسا دیکھو تو نماز پڑھو

مدینہ میں باقاعدہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں۔ اس زمانہ میں آپ کو ایک بار ایک یہودی سے قرض لینے کی ضرورت پیش آئی جس کا نام زید بن سعنہ تھا۔ قرض کی ادائگی کے لئے جو مدت طے ہوئی تھی، ابھی اس میں چند دن باقی تھے کہ یہودی تقاضا کرنے کے لئے آگیا۔ اس نے آپ کے کندھے کی چادر اتار لی اور کُرتا پکڑ کر سختی سے بولا: "میرا قرض ادا کرو۔" پھر کہنے لگا "عبدالمطلب کی اولاد بڑی نادہند ہے"

حضرت عمر فاروق رض اس وقت آپ کے ساتھ تھے۔ یہودی کی بدتمیزی پر ان کو سخت غصہ آگیا۔ انھوں نے اس کو ڈانٹا۔ قریب تھا کہ اس کو مارنا شروع کر دیتے مگر پیغمبر اسلام صرف مسکراتے رہے۔ یہودی سے صرف اتنا کہا: ابھی تو وعدہ میں تین دن باقی ہیں (لقد بقی من اجله ثلاث) پھر عمر فاروق رض سے فرمایا:

انا وهو كنا الى غير هذا امنك احوج یا عمر، تامرنی بحسن القضاء وتامره بحسن التقاضی

(رواه البیہقی مفصلاً)

عمر! میں اور یہ یہودی تم سے ایک اور برتاؤ کے زیادہ ضرورت مند تھے، مجھ سے تم بہتر ادائگی کے لئے کہتے اور اور اس سے بہتر تقاضے کے لئے۔

پھر عمر فاروق رض سے فرمایا کہ جاؤ فلاں شخص سے کھجوریں لے کر اس کا قرض ادا کر دو۔ اور بیس صاع (تقریباً ۴۰ کیلو) زیادہ دینا، کیونکہ تم نے اسے جھڑکا تھا۔

پیغمبر اسلام کو اپنی زندگی میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ عرب سے لے کر فلسطین تک کے علاقہ کے حکمراں بن گئے۔ رسول اللہ ہونے کی وجہ سے آپ کی زبان قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ آپ ایسے لوگوں کے درمیان تھے جو آپ کی عقیدت و تعظیم اتنی زیادہ کرتے تھے جو کبھی کسی انسان کی نہیں کی گئی۔ حدیبیہ کی بات چیت کے موقع پر عروہ بن مسعود قریش کے سفیر کی حیثیت سے آئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ دوڑ پڑتے ہیں کہ آپ کا غسالہ زمین پر گرنے سے پہلے ہاتھ پر لے لیں اور اس کو تبرک کے طور پر جسم پر ملیں۔ انس رض کہتے ہیں کہ انتہائی محبت کے باوجود ہم لوگ آنکھ بھر کر آپ کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مغیرہ کہتے ہیں کہ کسی صحابی کو آپ کی رہائش گاہ پر دستک دینے کی ضرورت ہوتی تو وہ ناخن سے دروازہ کھٹکھٹاتا تھا۔ جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سرخ چادر اوڑھ کر چاندنی رات میں سو رہے تھے۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا، کبھی آپ کو۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آپ چاند سے زیادہ خوش نما ہیں (فاذا هو احسن عندی من القمر) حنین میں جب جنگ کے شروع میں مسلم فوج کو شکست ہوئی اور مخالف فوج نے آپ کے اوپر تیروں کی بارش شروع کر دی تو آپ کے ساتھیوں نے آپ کو گھیرے میں لے لیا، وہ سارے تیر اپنے ہاتھ اور جسم پر اس طرح روکتے رہے جیسے وہ انسان نہیں، لکڑی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ساتھیوں کا یہ حال ہوا کہ ان کے جسم پر ساہی کے کانٹے کی طرح تیر لٹکنے لگے تھے۔

اس قسم کا مرتبہ اور عقیدت آدمی کے مزاج کو بگاڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ مگر آپ لوگوں کے درمیان بالکل عام انسان کی طرح رہتے۔ کوئی تلخ تنقید یا اشتعال انگیز رویہ آپ کو آپے سے باہر کرنے والا ثابت نہ ہوتا۔ صحیحین میں حضرت انس رض سے منقول ہے کہ ایک دیہاتی آیا۔ اس نے آپ کی چادر کو زور سے کھینچا جس

کی وجہ سے آپ کی گردن میں نشان پڑ گیا۔ پھر بولا: "محمد! میرے یہ دو اونٹ ہیں۔ ان کی لاد کا سامان مجھے دو۔ کیونکہ جو مال تیرے پاس ہے، وہ نہ تیرا ہے، نہ تیرے باپ کا ہے۔" آپؐ نے فرمایا مال تو اللہ کا ہے اور میں اس کا عبد ہوں۔ پھر دیہاتی سے پوچھا "جو برتاؤ تم نے مجھ سے کیا، اس پر تم ڈرتے نہیں" وہ بولا نہیں۔ آپ نے پوچھا کیوں۔ اس نے کہا، مجھے معلوم ہے کہ تم برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے۔ آپ یہ سن کر ہنس پڑے اور حکم دیا کہ دیہاتی کو ایک اونٹ کا بوجھ جو، اور ایک کی کھجوریں دی جائیں۔

آپ پر خدا کی ہیبت اتنی طاری رہتی کہ آپ بالکل عجز اور بندگی کی تصویر بنے رہتے تھے۔ بہت کم بولتے، چلتے تو جھک کر چلتے۔ تنقید سے کبھی خفا نہ ہوتے۔ کپڑا پہنتے تو فرماتے کہ میں خدا کا بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں انما انا عبد البس کما یلبس العبد) کھانا کھاتے تو ادب کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے اور فرماتے کہ میں بندوں طرح کھانا کھاتا ہوں: (انا اکل کما یاکل العبد)

اس معاملہ میں آپ کے نزاکت احساس کا عالم یہ تھا کہ آپ کے ایک ساتھی نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک بار کہا: ماشاء اللہ وماشئت (جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) یہ سنتے ہی آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، آپ نے درشتی کے ساتھ فرمایا: اجعلتنی للہ ندا (کیا تم نے مجھے اللہ کے برابر کر دیا) تم کو اس طرح کہنا چاہیے: ماشاء اللہ وحدہ (وہ ہوگا جو اللہ چاہے) اسی طرح ایک صحابی نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصہما فقد غوی — جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ راہ راست پر ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے وہ گمراہ ہے۔

آپؐ نے یہ سن کر فرمایا: بئس خطیب القوم انت (تو قوم کا برا خطیب ہے) آپؐ نے پسند نہیں فرمایا کہ اللہ اور رسول کو تثنیہ کی ایک ہی ضمیر میں جمع کر دیا جائے۔

پیغمبر اسلام کے یہاں تین لڑکے پیدا ہوئے جو بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ چار صاحبزادیاں بڑی عمر کو پہنچیں۔ چاروں حضرت خدیجہ کے بطن سے تھیں۔ حضرت فاطمہؓ آپؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آپؐ حضرت فاطمہؓ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ کسی سفر سے واپس لوٹتے تو مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے گھر جاتے۔ ان کے ہاتھ اور پیشانی کو چومتے۔ حضرت عائشہ رضہ سے جمیعؓ بن عمیر صحابی نے پوچھا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب کون تھا۔ انھوں نے جواب دیا "فاطمہؓ"

مگر پیغمبر اسلام کی پوری زندگی آخرت میں ڈھل گئی تھی۔ اس لئے اولاد سے محبت کا مفہوم بھی آپ کے یہاں دوسرا تھا۔ ایک روایت جو نسائی کے سوا دوسری تمام کتب صحاح میں نقل ہوئی ہے، یہ ہے کہ علی مرتضیٰؓ نے ایک بار ابن عبد الواحد سے فرمایا۔ میں تجھ کو فاطمہ بنت رسولؐ کی ایک بات سناؤں جو سارے کنبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ ابن عبد الواحد نے کہا، ہاں۔

حضرت علیؓ نے کہا۔ فاطمہ کا یہ حال تھا کہ چکی پیستیں تو ہاتھ میں چھالے پڑ جاتے۔ پانی کی مشک اٹھانے کی وجہ

سے گردن میں نشان پڑ گیا تھا۔ جھاڑو دیتیں تو کپڑے میلے ہوجاتے۔ انھیں دنوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ خادم آئے۔ میں نے فاطمہ سے کہا تم اپنے والد کے پاس جاؤ اور اپنے لئے ایک خادم مانگو۔ فاطمہؓ گئیں۔ مگر وہاں ہجوم تھا مل نہ سکیں۔ اگلے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر آئے اور پوچھا کہ کیا ضرورت تھی۔ فاطمہ چپ ہوگئیں۔ میں نے قصہ بتایا اور یہ بھی کہا کہ میں نے ان کو کہلا کر بھیجا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سننے کے بعد فرمایا:

اتقی اللہ یا فاطمۃ وادی فریضۃ ربک واعمل عمل اھلک، واذا اخذت مضجعک فسبحی ثلثا وثلاثین واحمدی ثلاثا وثلاثین وکبری اربعا وثلاثین، فذلک مائۃ، ھی خیر لک من خادم	اے فاطمہ خدا سے ڈرو۔ اپنے رب کے فرائض ادا کرو، اپنے گھر والوں کا کام کرو۔ جب بستر پر جاؤ تو ۳۳ بار خدا کی تسبیح کرو، ۳۳ بار خدا کی حمد کرو۔ ۳۴ بار خدا کی تکبیر کرو۔ یہ پورا سو ہوگیا۔ یہ تمھارے لئے خادم سے بہتر ہے۔

حضرت فاطمہؓ نے یہ سن کر کہا رضیت عن اللہ وعن رسولہ (میں خدا اور رسول سے اس پر خوش ہوں) حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بس یہ جواب دیا اور فاطمہ کو خادم نہیں دیا۔ (ولم یخدمھا)

پیغمبر اسلام پر جو حقیقت کھولی گئی، وہ یہ تھی کہ یہ عالم بے خدا نہیں ہے۔ اس کا ایک خدا ہے اور وہی اس کا خالق اور مالک ہے۔ سارے انسان اس کے بندے ہیں اور اسی کے سامنے بالآخر جواب دہ ہیں۔ مرنے کے بعد آدمی ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ دوسری دنیا میں اپنی مستقل زندگی شروع کرنے کے لئے داخل ہوجاتا ہے۔ وہاں نیک آدمیوں کے لئے جنت کا آرام ہے اور برے لوگوں کے لئے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ۔

خدا نے جب آپ کو اس حقیقت کا علم دیا تو یہ بھی حکم دیا کہ سارے انسانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کردو۔ مکہ کے کنارے صفا نام کی ایک چٹان تھی جو اس زمانہ میں عوامی اجتماعات کے لئے قدرتی اسٹیج کا کام دیتی تھی۔ آپؐ نے صفا پر چڑھ کر لوگوں کو پکارا۔ جب لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے تقریر کی۔ آپ نے خدا کی عظمت و کبریائی بیان کرنے کے بعد کہا:

واللہ لتموتن کما تنامون ولتحیون کما تستیقظون وانھا لجنۃ ابداً اولنار ابداً	خدا کی قسم تم یقیناً مروگے جس طرح تم سوتے ہو اور دوبارہ زندہ ہوگے جس طرح تم جاگتے ہو۔ اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لئے جنت ہے یا ہمیشہ کے لئے آگ۔

زمانہ کے خلاف کسی طریقہ کو آدمی صرف ذاتی طور پر اختیار کرے، اس وقت بھی اگرچہ قدم قدم پر مشکلیں پیش آتی ہیں، تاہم یہ مشکلیں جارحانہ نوعیت کی نہیں ہوتیں۔ یہ مشکلیں آدمی کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ مگر وہ آدمی کے جسم کو زخمی نہیں کرتیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ آدمی کے خاموش صبر کا امتحان ہوتی ہیں۔ مگر اس وقت صورت حال بالکل بدل جاتی ہے جب آدمی زمانہ کے خلاف ایک آواز کا داعی بن کر کھڑا ہوجائے، جب وہ دوسروں سے کہنے لگے کہ یہ کرو اور وہ نہ کرو۔ پیغمبر اسلام صرف ایک بندۂ مومن نہ تھے بلکہ پیغام الٰہی کو دوسروں تک پہنچانے کا مشن بھی آپ کے سپرد کیا گیا۔

تھا۔ آپ کی اس دوسری حیثیت نے آپ کو پوری عرب قوم سے ٹکرادیا۔ فاقہ سے لے کر جنگ تک سخت ترین حالات پیش آئے۔ مگر ۲۳ سال کی پوری زندگی میں آپ مکمل طور پر انصاف اور تقویٰ پر قائم رہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ کے اندر انسانی جذبات نہیں تھے، اصل یہ ہے کہ خدا کے خوف نے آپ کو پابند بنا رکھا تھا۔

ہجرت کے تیسرے سال مکہ کے مخالفین نے مدینہ پر چڑھائی کی اور وہ معرکہ پیش آیا جس کو غزوۂ احد کہا جاتا ہے اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں نے فتح پائی۔ مگر اس کے بعد آپ کے بعض ساتھیوں کی غلطی سے دشمنوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے پیچھے سے حملہ کرکے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ یہ بڑا بھیانک منظر تھا۔ آپ کے اکثر ساتھی میدان جنگ سے بھاگنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ مسلح دشمنوں کے نرغہ میں تنہا ہوگئے۔ مخالف ہجوم بھوکے بھیڑیئے کی طرح آپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو پکارنا شروع کیا الی عباد اللہ (خدا کے بندو میری طرف آؤ) من رجلٌ یشری لنا نفسہ (کون ہے جو ہمارے لئے اپنی جان قربان کرے) کون ہے جوان ظالموں کو مجھ سے ہٹائے، وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا (مسلم)

وہ کیسا ہولناک سماں ہوگا۔ جب خدا کے رسول کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکل رہے تھے۔ اگرچہ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک تعداد نے آپ کی پکار پر لبیک کہی۔ مگر اس وقت اتنا انتشار کا عالم تھا کہ آپ کے جاں نثار بھی آپ کو پوری طرح بچانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ عتبہ ابن ابی وقاص نے آپ کے اوپر ایک پتھر پھینکا۔ یہ پتھر آپ کو اتنے زور سے لگا کہ ہونٹ کچل گئے اور نیچے کے دانت ٹوٹ گئے۔ عبداللہ ابن قمیہ قریش کا مشہور پہلوان تھا۔ اس نے آپؐ پر شدید حملہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں لوہے کی خود کی دو کڑیاں آپ کے رخسار میں گھس گئیں۔ یہ کڑیاں اتنی گہرائی تک گھسی تھیں کہ ابوعبیدہ بن الجراح نے جب ان کو نکالنے کے لئے اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو ابوعبیدہ رضؓ کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ایک اور شخص عبداللہ بن شہاب زہری نے آپ کو پتھر مارا جس سے آپ کی پیشانی زخمی ہوگئی۔ مسلسل خون بہنے سے آپ بے حد کمزور ہوگئے۔ حتیٰ کہ آپ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ میدان میں جب آپ دیر تک نظر نہیں آئے تو مشہور ہوگیا کہ آپ شہید ہوگئے۔ اس دوران میں آپ کے ایک صحابی کی نظر گڑھے کی طرف گئی وہ آپ کو دیکھ کر خوشی میں بول پڑے: "رسول اللہ یہاں ہیں"، آپ نے انگلی کے اشارے سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو۔ دشمنوں کو میری یہاں موجودگی کا علم نہ ہونے دو۔ (فاشار الیہ الرسول ان اصمت، نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین، محمد الخضری، صفحہ ۱۳۰)

ایسے خوفناک حالات میں آپ کی زبان سے قریش کے بعض سرداروں (صفوان، سہیل، حارث) کے لئے بددعا کے الفاظ نکل گئے۔ آپ نے کہا: کیف یفلح القوم شجوا نبیھم (وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جو اپنے نبی کو زخمی کرے) آپ کی زبان سے اتنی بات بھی اللہ کو پسند نہیں آئی۔ اور جبریل خدا کی طرف سے یہ وحی لے کر آگئے:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ (آل عمران)

تم کو معاملہ کا کوئی اختیار نہیں۔ خدایا ان کو توبہ کی توفیق دے گا یا ان کو عذاب دے گا۔ کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔

خدا کی طرف سے اتنی تنبیہہ کافی تھی۔ فوراً آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ آپ زخموں سے نڈھال ہیں۔ مگر ظالموں

کے حق میں ہدایت کی دعا فرما رہے ہیں۔ آپ کے ایک ساتھی عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ "اس وقت بھی گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے سامنے ہیں آپ اپنی پیشانی سے خون پونچھتے جاتے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں :

رب اغفر لی قومی فانھم لا یعلمون — خدایا میری قوم کو معاف کردے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے

مسلم، غزوہ احد، جلد ۲، صفحہ ۱۰۸)

اوپر جو واقعات نقل کیے گئے، وہ اس قسم کے ان بے شمار واقعات میں سے صرف چند ہیں جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کس طرح انسانی کردار کا معیاری نمونہ تھی۔ یہ واقعات عمل کی زبان میں یہ سبق دیتے ہیں کہ انسان خدا کا بندہ ہے اور اس کو ہر حال میں خدا کا بندہ بن کر رہنا چاہیے خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا تقاضا ہے کہ بندے کے دل میں ہر وقت خدا کا اور اس کی آخرت کا طوفان برپا رہے ساری کائنات اس کے لئے یاد الٰہی کا دستر خوان ہو جائے۔ وہ ہر واقعہ کو خدا کی نظر سے دیکھے اور ہر چیز میں خدا کا نشان پائے۔ دنیا میں کوئی معاملہ کرتے وقت وہ کبھی یہ نہ بھولے کہ بالآخر سارا معاملہ خدا کے ہاتھ میں جانے والا ہے۔ جہنم کا خوف اس کو انسانوں سے تواضع اختیار کرنے پر مجبور کرے اور جنت کا شوق دنیا کو اس کی نظر میں بے حقیقت بنا دے۔ خدا کی بڑائی کا خیال اس کے ذہن پر اس قدر چھا جائے کہ اپنی بڑائی کا کوئی بھی مظاہرہ اس کو مضحکہ خیز دکھائی دینے لگے۔ کوئی تنقید اس کو مشتعل نہ کرے اور کوئی تعریف اس کے ذہن کو بگاڑنے والی ثابت نہ ہو ——— یہ ہے انسانی کردار کا وہ نمونہ جو خدا کے رسولؐ نے اپنے عمل سے ہمیں بتایا ہے۔

نوٹ : ۸ مئی ۱۹۷۷ کو چندی گڑھ میں ایک سیرت کانفرنس ہوئی جس میں مقامی غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر یہ مقالہ بہ شکل تقریر پیش کیا گیا۔

پیغمبر اسلام کی زندگی دنیا میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور سب سے زیادہ مکمل زندگی ہے۔ مگر سیرت کی بے شمار کتابوں کے باوجود آپ کی اصل سیرت لکھنے کا کام ابھی تک باقی ہے۔ سیرت کی قدیم کتابوں میں اشعار، بے اصل قصے اور غزوات کا پہلو اتنا غالب ہے کہ اس نے رسول کی اصل سیرت کو ڈھک لیا ہے۔ بعد کے دور میں سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں فقہی مسائل، کلامی بحثیں، تعبیری اضافے اصل سیرت کو چھپائے ہوئے ہیں۔ کوئی سیرت کو عنوان بنا کر اسلام کا دائرۃ المعارف مرتب کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

ضرورت ہے کہ سیرت پر ایک ایسی جامع کتاب تیار کی جائے جو صرف "سیرت" ہو۔ وہ آپ کی زندگی کا واقعاتی مرقع ہو۔ وہ نہ "مغازی" کی داستان ہو اور نہ دوسری، سیرت سے غیر متعلق بحثوں سے اس کو بوجھل بنایا گیا ہو۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو کافی محنت اور وسیع ذرائع چاہتا ہے۔ تاہم اگر ایسی ایک کتاب وجود میں آجائے تو وہ موجودہ زمانہ میں لکھی جانے والی لاکھوں کتابوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگی۔

جنت والے

امام نسائی نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے۔ ایک بار تین دن تک مسلسل یہ ہوتا رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں یہ فرماتے کہ اب تمھارے سامنے ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہل جنت میں سے ہے۔ ہر بار یہ آنے والے انصار میں سے ایک شخص ہوتے۔ یہ دیکھ کر عبد اللہ بن عمرو بن عاص کو جستجو ہوئی کہ آخر وہ کون سا عمل کرتے ہیں جس کی بنا پر آپ نے ان کے بارے میں بار بار یہ بشارت سنائی ہے۔ چنانچہ وہ ایک بہانہ کر کے گئے اور تین روز تک مسلسل ان کے یہاں رات گزارتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شاید کوئی خاص عبادت کرتے ہوں گے جس کی وجہ سے ان کو یہ مقام ملا۔ مگر ان کی عبادت اور شب گزاری میں کوئی غیر معمولی چیز ان کو دکھائی نہ دی۔ آخر انھوں نے خود ہی ان سے پوچھا کہ بھائی، آپ کون سا ایسا عمل کرتے ہیں جس کی بنا پر ہم نے رسول اللہ کی زبان سے آپ کے بارے میں یہ عظیم بشارت سنی ہے۔ انھوں نے کہا، میری عبادت کا حال تو وہی ہے جو آپ نے دیکھا البتہ ایک بات شاید اس کا سبب بنی ہو، اور وہ یہ کہ:

لا اجد فی نفسی غلا لاحد من المسلمین

ولا احسد احدا علی خیر اعطاہ اللہ تعالی

میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کوئی کینہ نہیں رکھتا۔ اور نہ کسی ایسی بھلائی پر جو اللہ نے اسے دی ہو، اس سے حسد کرتا ہوں۔

زندگی کیا ہے، موت کی طرف ایک سفر۔ ہر شخص دوسروں کو اپنے سامنے مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔

کوئی رصدگاہ اگر کسی دن یہ دریافت کرے کہ زمین کی جذب وکشش کی قوت ختم ہوگئی ہے تو اگلے دن یہی دریافت تمام اخباروں کی شاہ سرخی ہوگی۔ کیوں کہ اس قسم کی خبر زمین کے لئے موت کے سفر کے ہم معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کا کرہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہوجائے اور چند ہفتوں کے اندر اپنے سے بارہ لاکھ گنا بڑے سورج کے الاؤ میں اس طرح جا گرے جیسے دنیا کے سب سے بڑے آتش فشاں کے اندر کوئی ایک تنکا۔

زمین کے لئے موت کے سفر کی خبر کسی دن اخبار میں چھپ جائے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا۔ ہم میں سے ہر شخص اس قسم کے ہولناک تر سفر میں ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس سے چوکنا ہو اور اپنی زندگی کے آئندہ مراحل میں بربادی سے بچنے کی فکر کرے — سب سے بڑا مسئلہ "موت" کا مسئلہ ہے۔ مگر لوگ "زندگی" کے مسائل میں اتنا الجھے ہوئے ہیں کہ کسی کو موت کے مسئلہ پر دھیان دینے کی فرصت نہیں۔

AL-MARKAZ-UL-ISLAMI (Regd.)

ISLAMIC CENTRE

JAMIAT BUILDING - QASIMJAN STREET - DELHI 110006 (India)

اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو خدا کے آگے سپرد (SURRENDER) کر دینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے کارنامہ زندگی کا حساب لے گا۔ اس کے بعد اپنے وفادار بندوں کے لئے دائمی جنت کا فیصلہ کرے گا، اور غیر وفادار بندوں کو دائمی جہنم میں ڈال دینے گا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہہ سکتے ہیں۔

یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر وقت خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کو کھلے اور چھپے ہر حال میں دیکھ رہا ہے، بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ بالآخر وہی چیز صحیح قرار پائے گی جس کو خدا صحیح کہے اور وہ سب کچھ غلط ٹھہرے گا جس کو خدا غلط ٹھہرائے۔

اسی کے ساتھ مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو دوسری تمام قوموں تک پہنچائے۔ اس سنگین واقعہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے پہلے انبیاء آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری نبی آخر الزماں کی امت پر ڈال دی گئی ہے، مسلمان پر جس طرح خود عمل کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک کام، دوسرے کام کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتا۔

اسلامی مرکز کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو دنیوی مہم کے بجائے اُخروی مہم کے طور پر سامنے لایا جائے۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ان احساسات کو جگائے، اور دوسری قوموں تک حق کا پیغام پہنچانے کی تدبیریں اختیار کرے۔

اسلامی مرکز کے سامنے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو وقت کے اسلوب اور زمانہ حاضر کی زبان میں لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ تاکہ جس اسلام کو وہ تقلیدی طور پر مانتے ہیں، وہ ان کے ذہن کی غذا بن سکے، وہ ان کے اندر عمل کی حرارت پیدا کرنے لگے۔ وہ ان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ نہ ہو، بلکہ وہی ان کی کل زندگی بن جائے۔ ہر عہد کا ایک فکری معیار ہوتا ہے، اور کسی انسان کی زندگی میں کوئی فکر اسی وقت غالب فکر بن کر داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اس کو اس فکری معیار پر ملے جس کے اندر وہ سانس لے رہا ہے۔

اسلامی مرکز کے سامنے دوسرا کام، مسلمانوں کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھانا ہے۔ دعوت ہی واحد کام ہے جو مسلمانوں میں عمل کا حوصلہ ابھار سکتا ہے، ان کے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرتا ہے، ان کو خدا کی اجتماعی نصرتوں کا مستحق بناتا ہے۔ ان کو آخرت میں خدا کے گواہ کا درجہ عطا کرتا ہے جس سے بڑا کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں۔

اسلامی مرکز انھیں دونوں مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ کسی قسم کی سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو آنے والے یوم الحساب سے ہوشیار کرنے کی ایک مہم ہے۔ زندگی میں آدمی کو بے شمار مسائل نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد ایک ہی مسئلہ اس کے سامنے ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ موت سے پہلے آدمی اس مسئلہ سے آگاہ ہو جائے، موت سے پہلے وہ اس کی تیاری میں اپنے کو لگا دے۔

ہمارا پروگرام

۱ عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجرا، جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جا سکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳ قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت۔

۴ حدیث، سیرت، حالاتِ صحابہؓ، تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات) پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵ ایسی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت، تقابلِ مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶ اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷ مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸ اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

۹ علمی طرز فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰ جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہو سکے۔

۱۱ ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

اسلامی مرکز کے سلسلہ میں تمام امور کے لئے براہ راست صدر سے رجوع کیا جائے

خطوط وغیرہ پر حسب ذیل پتہ تحریر کیا جائے:

مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز، جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

MAULANA WAHIDUDDIN KHAN
PRESIDENT, ISLAMI MARKAZ
JAMIAT BUILDING
QASIMJAN STREET, DELHI 6

اسلامی تاریخ: ایک مطالعہ

نبیوں کی دعوت ایک تھی۔ مگر ان کی تاریخیں مختلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دعوت کیا ہو، اس کا تعلق صرف داعی سے ہے۔ جب کہ تاریخ کا تعلق داعی اور مدعو دونوں سے ہو جاتا ہے۔ تمام انبیاؑ کو خدا کی طرف سے ایک ہی دین ملا اور وہ ایک ہی دعوت کو لے کر ہمیشہ اپنی مخاطب قوموں کے سامنے کھڑے ہوتے رہے۔ مگر مدعو اقوام کا ردعمل مختلف رہا، اس لئے ان کے تعلق سے جو تاریخ بنی، وہ یکساں نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے وطن عراق میں ساتھی نہ ملے تو آنجناب اپنے بھتیجے اور اپنی اہلیہ کو لے کر غیر آباد جگہ چلے گئے کہ وہاں توحید کا ایک عبادت خانہ بنائیں۔ حضرت یوسفؑ کی شخصیت اور تعبیر رویا سے مصر کا بادشاہ متاثر ہو گیا۔ اس طرح آپ کو موقع ملا کہ اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحت انتظام ملکی کا عہدہ سنبھال سکیں۔ حضرت موسیٰؑ کو مصر سے نکلنے کے بعد ایک پوری قوم (بنی اسرائیل) کی سیادت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ آپ نے صحرائے سینا کی آزاد فضا میں قوانین الٰہی کی بنیاد پر ایک معاشرہ قائم کیا۔ حضرت مسیحؑ نے دعوتی مرحلہ میں فلسطین کے رومی اقتدار سے کشمکش پیدا کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا، اس لئے اپنے شاگردوں کو تلقین کی کہ ——— "جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی اسی دین کی طرف تھی جو دوسرے انبیاء لے کر آئے۔ مگر آپ کی قوم نے جہاں آپ کی شدید مخالفت کی، قوم کے اندر سے ہزاروں کی تعداد میں آپ کو اعلیٰ درجہ کے ساتھی بھی مل گئے آپ نے قوم کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف اپنے ساتھیوں کو منظم کیا۔ مقابلہ میں اللہ کی مدد سے آپ کو فتح حاصل ہوئی اور اسلام کا اقتدار قائم ہو گیا۔

اسلامی غزوات میں دشمنان خدا کا قتل کیا جانا اسی طرح اسلامی تاریخ کا ایک اضافی جزء تھا جس طرح اس سے پہلے حضرت یحییٰ اور اصحاب الاخدود کا قتل ہو جانا۔ مگر بعد کے دور میں جب اسلام کی تاریخیں لکھی گئیں تو جنگ و مقابلہ کا پہلو اس کے اوپر چھا گیا۔ کیونکہ قدیم ذوق کے مطابق اسلامی تحریک کے غیر سیاسی پہلو بہت کم قلم بند ہو سکے۔ البتہ قتال اور سیاسی معرکہ آرائیوں کے واقعات کو خوب نمایاں کر کے بیان کیا گیا۔ اس طرح اسلام کی مدون تاریخ عملاً مغازی اور فتوحات کی داستان بن کر رہ گئی۔

اگر ایسا ہوتا کہ عرب کے سردار، حضرت یوسفؑ کے ہم عصر مصری حکمراں کی طرح، آغاز ہی میں اسلام سے متاثر ہو جاتے یا ملکۂ سبا کی طرح رومی حکمراں اسلام قبول کر لیتا تو اسلام کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ سے عقیدہ اخذ کرنا کیوں صحیح نہیں ہے۔ اس قسم کی کوشش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ حضرت یوسفؑ کو ماننے والے کہیں گے کہ پیغمبرانہ طریق کار یہ ہے کہ وقت کے حکمراں سے صاف لفظوں میں مطالبہ کیا جائے کہ اجعلنی علی خزائن الارض

(زمین کے خزانے میرے حوالے کردو) حضرت مسیح کو ماننے والے کہیں گے کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ حکومت وقت سے تعرض نہ کرتے ہوئے خدا کے حقوق ادا کئے جاتے رہیں۔ حضرت ابراہیم سے اسوہ لینے والوں کو اصل کام یہ نظر آئے گا کہ جب لوگ دعوت حق کو نہ مانیں تو داعی کو چاہئے کہ وہ بستی کو چھوڑ کر دور کسی صحرا میں چلا جائے اور وہاں خدا کا گھر بنا کر عبادت کرے۔ نبی آخر الزماں کو ماننے والے کہیں گے کہ بدر و احد اور حنین و احزاب کے معرکے گرم کرنے کا نام اسلام ہے۔ قرآن میں ہے کہ تمام پیغمبروں کو اللہ نے ہدایت دی (انعام۔ ۸۴) تو تم انھیں کے راستہ پر چلو (انعام۔ ۹۰) اب اگر تاریخ سے عقیدہ اخذ کیا جائے تو وہ کون سا واحد راستہ ہوگا جس پر چلنا تمام نبیوں کے راستہ پر چلنے کے ہم معنی ہو۔

خدا کا دین، عقیدہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔ مگر ہم عقیدہ کو عقیدہ سے سمجھ سکتے ہیں اس کو تاریخ سے اخذ نہیں کر سکتے۔

قرآن کی مکی سورتوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی دس سالہ زندگی سے ثابت ہے کہ مکہ میں اسلام کی دعوت بالکل غیر سیاسی انداز میں شروع ہوئی تھی۔ توحید، آخرت اور مواسات بنی آدم کی طرف آپ لوگوں کو متوجہ کرتے اور ایک خدا کی عبادت کی طرف بلاتے۔ آپ نے یا آپ کے ساتھیوں نے کبھی کسی کے خلاف تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نہ کسی قسم کی سیاسی منازعت کی۔ اس کے باوجود مکہ کے سردار بالکل یک طرفہ طور پر آپ کے خلاف ہو گئے۔ انھوں نے آپ پر اور مسلمانوں پر ہر قسم کے ظلم ڈھانا شروع کئے۔ سب وشتم سے لے کر سماجی اور معاشی بائیکاٹ تک ہر چیز کو آپ یک طرفہ طور پر برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے طے کیا کہ سب مل کر آپ کو قتل کر ڈالیں۔ اس وقت آپ مکہ سے ہجرت کرکے عرب کے دوسرے شہر یثرب چلے گئے۔

سرداران عرب نے اب بھی آپ کو نہ چھوڑا۔ وہ فوج لے کر آئے تاکہ اسلام کے مرکز کو تباہ کر ڈالیں۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلے۔ یہ جنگ آپ کی طرف سے تمام تر دفاعی تھی (بقرہ۔ ۱۹۰) بدر کے مقام پر دونوں گروہوں میں مقابلہ ہوا۔ خدا کی مدد آپ کے شامل حال رہی اور سرداران عرب کو زبردست شکست ہوئی۔ اس شکست نے ان کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ اب محاذ جنگ اور وسیع ہو گیا۔ مکہ کے قریش اور مدینہ اور خیبر کے یہود اسلام کو مٹانے کے لئے متحد ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں احد (۳ھ) سے لے کر حنین (۸ھ) تک مسلسل جھڑپوں اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوئی اور مشرکین اور یہود دونوں کا زور ٹوٹ گیا۔

عرب کے مشرکین اور یہود نے مل کر اسلام کو فنا کرنے کے لئے جو جارحانہ اقدام کیا تھا، اس میں انھیں مکمل ناکامی ہوئی۔ تاہم ان کے بچے کھچے افراد نے اب ایک اور منصوبہ بنایا۔ انھوں نے یہ کوشش شروع کی کہ بیرونی حکومتوں (ایران و روم) کو اسلام کے خلاف ابھارا جائے اور ان کے ذریعہ اس کو کچلنے کی کوشش کی جائے۔ یہ حکومتیں پہلے ہی سے عرب میں ایک نئی طاقت کے ابھرنے کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ اب خود عربوں ہی کے ایک طبقہ کی حمایت ملی تو وہ اور زیادہ جری ہو گئیں۔ تاہم یہ واقعہ اسلام کے حق میں ایک عظیم تائید غیبی ثابت ہوا، کیونکہ اس وقت کی آباد دنیا پر عملاً انھیں دونوں سلطنتوں کا غلبہ قائم تھا۔ ان کی طرف سے قتال کے آغاز نے مسلمانوں کو موقع دے دیا کہ وہ افغانستان

سے لے کر اسپین تک فتح کرتے چلے جائیں بغیر اس کے کہ ان پر جارحیت کا الزام عائد ہوتا ہو۔

عرب کے پڑوس میں اس زمانہ کی دو سب سے بڑی سلطنتیں قائم تھیں۔ پورب میں خلیج فارس کے دوسری طرف ساسانی سلطنت تھی جس کے قبضہ میں موجودہ ایران کے علاوہ اطراف کے ملکوں (پاکستان، افغانستان، ترکی، عراق) کے حصے بھی شامل تھے۔ پچھم کی طرف بحر احمر کے دوسری جانب رومی سلطنت تھی جو شام و فلسطین سے شروع ہو کر بحر روم کے کنارے کنارے افریقہ کے تمام شمالی ملکوں پر قابض تھی۔ اس کے آگے اس کی سرحدیں یورپ میں بہت دور تک چلی گئی تھیں۔

ان دو شہنشاہیتوں نے قلب عرب کے خشک بیابان کو چھوڑ کر اس کے سرحدی علاقوں میں چاروں طرف اپنی ماتحت عرب ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ اپنے زیر اثر علاقوں میں انھوں نے اپنے مذہب کو بھی پھیلا رکھا تھا۔ عرب کو اپنی سلطنت کا براہ راست حصہ نہ بنا کر بھی وہ اس کو اپنا ماتحت سمجھتے تھے۔ ابو طالب کی وفات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے موسمی بازاروں میں گئے اور مختلف قبائل کے سامنے اپنے کو پیش کیا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے لو تاکہ میں خدا کا پیغام پہنچانے کا کام کر سکوں۔ اس سلسلہ میں ایک سرحدی قبیلہ بنو شیبان کے سرداروں سے آپ کی گفت گو تاریخ میں نقل ہوئی ہے۔ گفتگو کا ایک حصہ یہ تھا:

قال المثنیٰ بن حارثہ: انما نزلنا بین صیرین، احدھما الیمامۃ والاخریٰ السمامۃ، فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما ھذان الصیران فقال لہ: اما احدھما فطفوف البر وارض العرب، واما الآخر فارض فارس وانھار کسریٰ، وانما نزلنا علی عھد اخذ علینا کسریٰ ان لا نحدث حدثا، ولا نؤوی محدثا۔ ولعل ھذا الامر الذی تدعوا الیہ تکرھہ الملوک۔ فاما ما کان یلی بلاد العرب فذنب صاحبہ مغفور وعذرہ مقبول۔ واما ما کان مما یلی بلاد فارس فذنب صاحبہ غیر مغفور، وعذرہ غیر مقبول۔ فان اردت ان ننصرہ مما یلی العرب فعلنا۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اسأتم الرد اذا فصحتم بالصدق

(البدایہ والنہایہ)

مثنی بن حارثہ نے کہا، ہمارا قیام دو سرحدوں کے درمیان ہے۔ ایک یمامہ دوسرے سمامہ۔ آپؐ نے پوچھا یہ دو سرحدیں کیا ہیں۔ سردار قبیلہ نے کہا، ایک طرف عرب کی زمین اور اس کی پہاڑیاں ہیں۔ دوسری طرف ایران کی زمین اور اس کی ندیاں ہیں اور ہم وہاں ایک معاہدہ کے تحت مقیم ہیں جو کسریٰ نے ہم سے لیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم کوئی نئی بات نہ کریں گے اور نہ کسی نئی بات کرنے والے کو پناہ دیں گے۔ اور یہ بات جس کی طرف آپ بلاتے ہیں، شاید بادشاہوں کو ناگوار ہو۔ بلاد عرب کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ خطا کار کو معاف کر دیتے ہیں اور عذر کو قبول کر لیتے ہیں۔ مگر بلاد فارس میں خطا کار کی معافی نہیں ہوتی اور اس کا عذر قبول نہیں کیا جاتا۔ پس اگر آپ عرب علاقہ میں ہماری امداد چاہیں تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، تم نے جواب دینے میں کوئی برائی نہیں کی اگر تم سچے ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیرونی سلطنتوں نے کس طرح عرب کو اپنے سیاسی مفادات کے تابع بنا رکھا تھا۔

نبوت کے پانچویں سال جب اہل مکہ کے مظالم سے تنگ آکر کچھ مسلمان حبش چلے گئے تو قریش کا ایک وفد وہاں پہنچا تھا اور حبش کے بادشاہ اصحمہ نجاشی کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس میں وہ ناکام رہے۔ اب انھوں نے ایران و روم کی شہنشاہیتوں کا رخ کیا۔ یہود اور مشرکین کے وفود رومی حکمرانوں اور ایرانی بادشاہوں سے ملے اور ان کو اسلام کے سیاسی خطرات سے آگاہ کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایک طرف باہر سے کوئی حکومت اسلام کے مرکز (مدینہ) پر حملہ کرے، دوسری طرف عرب قبائل میں اندر سے بغاوت پیدا کر دی جائے۔ اس طرح مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیا جائے۔ ایران و روم قدیم زمانہ کی سب سے بڑی سلطنتیں تھیں۔ ان کو قدیم آباد دنیا کے تقریباً تمام حصہ پر سیادت حاصل تھی۔ اس لئے انھیں اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا۔ وہ آسانی سے عرب کی اس نئی ابھرتی ہوئی قوت کو کچلنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے۔ ان خطوط کا اصل مقصد اسلام کی دعوت کو وقت کے حکمرانوں تک پہنچانا تھا۔ تاہم اس کا ایک متوقع فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ حکمراں اسلام کو اس کی اصل حیثیت میں سمجھ سکیں اور غلط پروپگنڈہ کی وجہ سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ نیز یہ بھی توقع تھی کہ اگر حکمرانوں میں سے کچھ لوگ اسلام کی دعوتِ فطرت سے متاثر ہو گئے تو یہودیوں اور مشرکوں کی سازشیں خود بخود کم زور پڑ جائیں گی۔ مکتوبات کی روانگی کے بعد یہ توقع جزوی طور پر پوری بھی ہوئی۔ بعض حکمراں (مثلاً عمان کے جلندی برادران) مسلمان ہو گئے۔ بعض (مثلاً مقوقس حاکم مصر) اسلام کے ہمدرد بن گئے۔

مگر دونوں بڑی سلطنتوں (ایران و روم) نے اس سے مختلف معاملہ کیا۔ اس کا پہلا شدید مظاہرہ اس وقت ہوا جب کہ عبداللہ بن حذافہ سہمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب لے کر ساسانی حکمراں خسرو پرویز کے دربار میں پہنچے۔ یہ خط بالکل سادہ مضمون پر مشتمل تھا۔ اس میں کوئی سیاسی بات نہ تھی۔ پورا خط صرف یہ تھا۔

> "محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ شاہ فارس کے نام۔ سلام اس شخص پر جو ہدایت قبول کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ میں تجھ کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں۔ میں تمام انسانوں کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں تاکہ اللہ کے عذاب سے ڈراؤں۔ اور جو لوگ انکار کریں، ان کے لئے عذر باقی نہ رہے۔
> اسلام قبول کرو، تمھارے لئے سلامتی ہوگی۔ اور اگر انکار کرو گے تو اپنی قوم مجوس کے انکار کا وبال بھی تمھارے اوپر ہوگا۔"

اس خط کو کسریٰ نے اپنی شان کے خلاف سمجھا اور غصہ میں بولا: میرا غلام ہو کر مجھ کو خطاب کرتا ہے (یکتب الی وھو عبدی)۔ اس نے آپ کے مکتوب کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ یہی نہیں۔ بلکہ بین اقوامی روایات کے تمام اصولوں کو توڑتے ہوئے آپ کے قاصد کو قتل کر ڈالا۔ اس وقت یمن اس کے ماتحت تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے یمنی گورنر باذان کو لکھا کہ محمدؐ کے پاس دو آدمی بھیجو جو ان کو گرفتار کر کے لائیں اور میرے دربار میں حاضر کریں"۔ اس حکم کی تعمیل میں باذان نے اپنے دو سپاہی مدینہ روانہ کئے جو ناکام واپس گئے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی حکمراں کتنے متکبر تھے اور عربوں اور مسلمانوں کو کتنا حقیر

سمجھتے تھے۔

مدینہ کے یہود جن کو ان کی سازشوں اور بدعہدیوں کی وجہ سے تورات کے قانون کے مطابق، مدینہ سے جلاوطن کردیا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے چالاک اور زبان آور ایلچیوں کو ایرانی دارالسلطنت مدائن بھیجا۔ انھوں نے ایرانیوں کو مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے خوب ابھارا۔ چنانچہ ایرانی حکومت نے جدید عربی طاقت کو ختم کرنے کا مکمل ارادہ کرلیا۔ خلیفہ اول کے زمانے میں باقاعدہ ٹکراؤ شروع ہوا۔ مگر نتیجہ ان کے خلاف نکلا اور خلیفہ ثانی کے زمانے میں تقریباً پوری ساسانی سلطنت اسلام کے جھنڈے کے نیچے آگئی۔ تاہم ساسانی سلطنت کا آخری وارث یزدگرد ابھی زندہ تھا۔ اس کے ساتھ کئی ہزار ایرانیوں کی جمعیت تھی۔ ان کی مدد سے وہ ایک قسم کی گوریلا وار حکومت اسلامی کے خلاف جاری کئے ہوئے تھا۔ بالآخر خلیفہ سوم کے زمانہ میں ایک پن چکی والے نے اس کو قتل کردیا۔ یہ واقعہ مرو کے پاس مرغاب میں ۲۳ اگست ۶۵۱ء کو پیش آیا۔ اس کے بعد ایرانی سلطنت کا کوئی دعوے دار باقی نہ رہا۔

رومی شہنشاہ ہرقل کو بھی آپ نے اسی قسم کا خط بھیجا، جیسا کسریٰ کو بھیجا تھا۔ اس نے اگرچہ آپ کے مکتوب کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی۔ تاہم شام میں ہرقل کی ماتحت جو غسانی ریاست قائم تھی، اس کے پاس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد حارث بن عمیر ازدی آپ کا مکتوب لے کر گئے تو بصریٰ کے حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی نے شام کی سرحد پر قاصد نبوی کو قتل کرادیا۔ یہ صریح طور پر ایک حکومت کی دوسری حکومت پر جارحیت تھی۔ چنانچہ آپ نے اس کے جواب میں تین ہزار کی ایک جمعیت کو سرحد شام کی طرف روانہ کیا۔ ہرقل نے اپنے غسانی حاکم کو تنبیہ کرنے کے بجائے اس مقابلہ میں اس کا پورا ساتھ دیا اور اس کی مختصر فوج کے ساتھ اپنی ایک لاکھ رومی فوج میدان میں اتار دی۔ عربوں اور رومیوں کے درمیان وہ پہلی جنگ پیش آئی جو تاریخ اسلام میں غزوہ موتہ (جمادی الاولیٰ ۸ھ) کے نام سے مشہور ہے۔

پھر بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ قیصر روم براہ راست میدان میں آگیا۔ عرب کی اس نئی ابھرتی ہوئی طاقت کو ابتدا ہی میں ختم کرنے کے لئے اس نے باقاعدہ تیاری شروع کردی۔ سرحد شام کے سردار اور شاہ غسان، جو قیصر کے باج گذار تھے، ان کے تعاون سے اس نے بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ مدینہ پر حملہ کرکے عرب کی اس ابھرتی ہوئی طاقت کو شروع ہی میں کچل دیا جائے۔ یہ رومی لشکر اسلامی دارالسلطنت کی طرف بڑھنا شروع ہوا اور بلقا تک پہنچ گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں ملیں تو انتہائی ناموافق حالات کے باوجود آپ نے مسلمانوں کو تیار ہونے کا حکم دے دیا اور رجب ۹ھ میں ۳۰ ہزار کا لشکر لے کر رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوئے۔ شام کی سرحد کو عبور کرکے آپ تبوک تک پہنچے تھے کہ معلوم ہوا کہ شاہ روم نے اس وقت مقابلہ کا ارادہ ترک کرکے اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا ہے۔

خلیفہ اول کے زمانے میں رومیوں سے باقاعدہ جنگ کا آغاز ٹھیک اسی مقام (موتہ) پر ہوا جہاں اس سے پہلے رومیوں نے مسلمانوں کی دو ہزار فوج کا خاتمہ کردیا تھا۔ بعد کے مقابلوں میں مسلمانوں کی کامیابی نے رومیوں کے مخالفانہ جذبات کو اور بڑھادیا اور وہ پوری طاقت سے مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ مگر اللہ کی مدد سے فیصلہ مسلمانوں کے موافق ہوتا چلا گیا۔ شام و فلسطین سے گزر کر یہ جنگ شمالی افریقہ کے رومی مقبوضات تک پہنچی اور مسلمان ایک کے بعد

ایک رومی ملکوں کو فتح کرتے ہوئے مراکش تک پہنچ گئے۔ اور بالآخر رمضان ۹۱ ھ میں آبنائے جبرالٹر کو پار کرکے اسپین میں داخل ہوگئے۔ یہ سارا علاقہ جو مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، وہ قدیم رومی سلطنت کا حصہ تھا۔ رومی حکمرانوں کی جارحیت خود ان کے خلاف پڑی اور آخرکار رومی حکمراں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اپنے تمام مشرقی مقبوضات کو مسلمانوں کے لئے چھوڑ کر اپنے مغربی دارالسلطنت (قسطنطنیہ) میں پناہ گزیں ہوجائے۔

صدر اول میں مسلمانوں کی جتنی جنگیں ہوئیں، وہ سب دیگر قوموں کے جارحانہ اقدامات کے جواب میں ہوئیں۔ عرب کے اندر قریش اور یہود سے، اور عرب کے باہر ایران و روم سے۔ یہ خدا کا خصوصی فضل تھا کہ جارحیت خود ان قوموں کے خلاف پڑی اور مسلمان ہر جگہ ان کو مغلوب کرتے چلے گئے۔

عرب کے پڑوس میں حبش کی، نسبتاً کمزور سلطنت تھی۔ مگر اس نے مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا۔ اس لئے مسلمانوں نے بھی اس کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں کی۔ اگرچہ اس کی یہ قیمت دینی پڑی کہ حبش (ایتھوپیا) آج شمالی افریقہ کا واحد ملک ہے جہاں مسلم آبادی سب سے کم ہے اور اس کی وجہ سے مسلم دنیا کے خلاف اس کا رویہ ہمیشہ معاندانہ رہتا ہے۔

ایرانیوں اور رومیوں کی طرف سے جارحانہ اقدام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے ایک ایسا قیمتی موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ ایشیا اور افریقہ سے گزر کر یورپ کو اس کی آخری سرحدوں تک فتح کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ سب انھیں جارح شہنشاہیتوں کے علاقے تھے اور ان کی جارحیت نے مسلمانوں کو ان کے اندر داخل ہونے کا پورا جواز فراہم کر دیا تھا۔ مگر مسلمانوں کے باہمی اختلافات، خاص طور پر صفین و جمل کی خانہ جنگیوں میں ۸۰ ہزار بہادر مسلمانوں کا کٹ جانا، وہ واحد حادثہ ہے جس نے اس امکان کو اپنی پوری شکل میں واقعہ بننے نہیں دیا۔

انسان صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

ایک سب سے بڑی بات جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا رہتا ہے، یہ کہ اس دنیا میں کسی انسان کو کوئی ذاتی طاقت حاصل نہیں۔ کوئی شخص نہ کسی کو کچھ دیتا، نہ کوئی شخص کسی سے کچھ چھینتا۔ ہر واقعہ جو اس زمین پر ہوتا ہے وہ خدا کی اجازت سے ہوتا ہے۔ انسان کی ساری حیثیت یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں امتحان کے لئے ہے۔ ارادہ کے سوا انسان کے بس میں اور کچھ نہیں۔ واقعات اس لئے اس کے سامنے لائے جاتے ہیں کہ اس کی جانچ ہو تاکہ اس کا خدا یہ دیکھے کہ اس کا بندہ مختلف رویوں میں سے کس رویہ کا اپنے لئے انتخاب کر رہا ہے۔ واقعات کا اہتمام مالک کائنات کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان تو صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

جب تاریخ کا رخ موڑ دیا گیا

قدیم عرب کے شمال اور جنوب کے زرخیز حصے اس زمانہ کی دو بڑی شہنشاہیتوں ساسانی سلطنت اور اور بازنطینی سلطنت کے قبضہ میں تھے۔ شمال میں عمارت غساسنہ اور امارت بُصری تھی۔ یہ دونوں بازنطینی سلطنت (رومیوں) کے ماتحت تھیں اور یہاں ان کی طرف سے عرب سردار حکومت کرتے تھے۔ رومی اثرات کے تحت یہاں کی اکثر آبادی مسیحی مذہب اختیار کرچکی تھی، عرب کے جنوب میں امارت بحرین، امارت عمان، امارت یمامہ تھی۔ یہ ریاستیں ساسانی سلطنت (ایرانیوں) کے ماتحت تھیں اور ان کے اثر سے یہاں کے باشندوں میں مجوسیت پھیلی ہوئی تھی۔

۶ھ میں جب حدیبیہ میں قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ ہوا اور حالات پرامن ہوگئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اطراف میں واقع سلطنتوں کو دعوتی مراسلے بھیجنے شروع کئے۔ اس سلسلے میں ایک مراسلہ حارث بن ابی شمر غسانی کے نام تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر شجاع بن وھب آپ کا مراسلہ لے کر اس کے پاس گئے۔ اس مراسلہ میں یہ بھی تھا کہ اللہ پر ایمان لاؤ تمہاری حکومت باقی رہے گی (یبقیٰ ملکک) اس نے مکتوب نبوی میں یہ جملہ پڑھا تو اس کو غصہ آگیا۔ اس نے خط کو زمین پر پھینک دیا اور کہا: میری حکومت مجھ سے کون چھین سکتا ہے (من ینزع ملکی منی)

حاکم بُصری شرجیل بن عمرو غسانی نے اس سے بھی زیادہ بیہودہ سلوک کیا۔ اس رومی گورنر کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حارث بن عمیر ازدی آپ کا خط لے کر گئے تھے، وہ سرحد شام پر قصبہ موتہ میں داخل ہوئے تھے کہ حاکم بصری کے اشارہ پر ایک اعرابی نے آپ کے سفیر کو قتل کردیا۔

بین اقوامی روایات کے مطابق یہ واقعہ ایک ملک پر دوسرے ملک کی جارحیت کے ہم معنی تھا۔ مختلف قرائن یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ شام کی فوجیں پیش قدمی کرکے مدینہ میں داخل ہوجانا چاہتی ہیں۔ رومی شہنشاہیت اس کو برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ عرب میں کوئی آزاد حکومت قائم ہو اور ترقی کرے۔

حارث بن عمیر کے قتل کی خبر مدینہ پہنچی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فوجی جواب دینا ضروری سمجھا۔ آپ نے حکم دیا کہ مسلمان اپنے اپنے ہتھیار لے کر موضع حرق میں جمع ہوجائیں۔ چنانچہ تین ہزار کی تعداد میں اسلامی لشکر اکٹھا ہوگیا۔ آپ نے اس لشکر پر زید بن حارثہ کو سردار مقرر کیا اور ضروری نصیحتیں کرنے کے بعد ان کو شام کی طرف روانہ کیا۔

اسلامی لشکر نے معان (شام) پہنچ کر قیام کیا۔ دوسری طرف حاکم بصری بھی جنگ کے لئے تیار ہوگیا۔ اس کی حوصلہ افزائی اس واقعہ سے بھی ہوئی کہ اتفاق سے ہرقل انھیں دنوں مآب (بلقاء) میں آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ مسلح فوج تھی۔ نیز اس علاقے کے عیسائی قبائل لخم، جذام، قین، بھراء، بلی بھی مسیحی حمیت کے جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بنی بلی کے سردار مالک بن زافلہ کی قیادت میں لڑنے کے لئے تیار ہوگئے۔ اس طرح شامی محاذ پر ایک لاکھ سے بھی زیادہ کا لشکر جمع ہوگیا جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔

یہ جنگ جو جمادی الاولیٰ ۸ھ میں ہوئی، اس میں زید بن حارثہ دشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اس کے بعد

جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ بھی قیادت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کا جھنڈا گر جانے سے انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس وقت لشکر اسلام کے ایک سپاہی ثابت بن اقرم نے بڑھ کر جھنڈا اٹھالیا اور بلند آواز سے کہا:

"مسلمانو! کسی ایک شخص کو امیر بنانے پر اتفاق کر لو"

مسلمان فوجیوں کی طرف سے آواز آئی رضینا بک (ہم تمہاری سرداری پر راضی ہیں) ثابت ابن اقرم نے جواب دیا: ما انا بفاعل فاتفقوا علی خالد بن الولید (میں یہ کام نہ کر سکوں گا تم لوگ خالد بن ولید کو اپنا سردار بنالو) ب آواز بلند ہوئی: ہم کو خالد بن ولید کی سرداری منظور ہے۔ یہ سنتے ہی خالد بن ولید نے آگے بڑھ کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رومی لشکر پر حملہ کر کے اس کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس جنگ میں بارہ مسلمان شہید ہوئے۔

تاہم یہ جنگ فیصلہ کن طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ رومیوں کی مدد سے غساسنہ مدینہ پر چڑھ آئیں اور اس نومولود ریاست کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ ذی الحجہ ۵ ھ میں بنو قریظہ کے خاتمہ کے بعد جب مدینہ میں بعض معاشی مسائل پیدا ہوئے اور ازواج رسول نے اضافہ نفقہ کا مطالبہ کیا تو آپ کو بہت رنج ہوا اور آپ نے ایک مہینہ تک گھر کے اندر نہ آنے کی قسم کھالی۔ اس سلسلے میں تاریخ میں آتا ہے کہ جب ایک صحابی عمر فاروق سے ملے اور ان سے کہا: "کچھ سنا آپ نے" تو عمر فاروق کی زبان سے فوراً نکلا: "کیا غساسنہ آگئے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں غسانیوں کی طرف سے مدینے کے لئے کتنا خطرہ لاحق تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسئلہ کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ اپنی عمر کے آخری ایام میں جن امور کے لئے آپ نے شدت سے اہتمام کیا، ان میں غساسنہ یا بالفاظ دیگر رومیوں سے مقابلہ کے لئے فوج کی تیاری بھی تھی۔ آپ نے اس مقصد کے لئے ایک فوج ترتیب دی۔ اس فوج میں اگرچہ ابوبکر وعمر جیسے بڑے بڑے اصحاب تھے مگر آپ نے انتہائی دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اس لشکر کا سردار اسامہ بن زید کو مقرر کیا۔ اسامہ نہ صرف ایک بہادر نوجوان تھے بلکہ ان کے دل میں رومیوں سے انتقام کا شدید جذبہ بھی موجزن تھا۔ کیونکہ موتہ کی جنگ میں رومیوں نے ان کے والد زید بن حارثہ کو قتل کیا تھا۔

تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں یہ لشکر روانہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ عین وقت پر آپ کے اوپر مرض الموت کا غلبہ ہو گیا۔ آپ کی وفات کے بعد صدیق اکبر نے خلیفہ اول کی حیثیت سے اس لشکر کو شام کی طرف روانہ کیا۔

یہ روانگی بھی اسلامی تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہر طرف سے ارتداد کی خبریں آنے لگیں۔ لوگوں نے خلیفہ اول کو مشورہ دیا کہ اب جبکہ مرکز اسلام خطرہ میں پڑ گیا ہے اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں اس لشکر کی روانگی کو ملتوی کر دیا جائے مگر صدیق اکبر کا یہ جواب لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے کافی تھا:

"اگر مجھ کو یقین ہو کہ لشکر کی روانگی کے بعد مجھ کو مدینہ میں کوئی درندہ تنہا پا کر پھاڑ ڈالے گا، تب بھی میں اس لشکر کی روانگی کو ملتوی نہیں کر سکتا جس کو خود رسول اللہ نے ترتیب دیا ہو" صدیق اکبر کی یہ ایمانی جرأت کام آئی۔ اسامہ کا لشکر نہ صرف رومیوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوا بلکہ رومی شہنشاہیت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فتح نے مرتدین کی بھی حوصلہ شکنی کی اور

نسبتاً آسانی کے ساتھ وہ مغلوب کر لیے گئے۔

اس واقعہ میں ایک اور بہت بڑی حکمت شامل تھی، عرب قبائل ہمیشہ سے آپس میں لڑتے چلے آرہے تھے شدید اندیشہ تھا کہ اپنی قوتوں کے اظہار کا دوسرا میدان نہ پاکر وہ دوبارہ آپس میں لڑنے لگیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے ساتھ عرب طاقت کو رومی شہنشاہیت سے متصادم کر کے اس کا جواب فراہم کر دیا۔ اب عربوں کی جنگجو فطرت کے لیے ایک بہترین میدان مل چکا تھا۔ چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ وہ لوگ جو اپنے ہم وطنوں کی قتل و غارتگری کے سوا کچھ نہ جانتے تھے انھوں نے ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ایک پوری دنیا کو فتح کر ڈالا۔

جان بیگٹ گلب پاشا نے اپنی کتاب دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد میں اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"عرب نامعلوم زمانے سے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ وجدل میں زندگی بسر کرنے کے عادی رہے تھے۔ یہ جنگ وجدل کسی خاص سبب کا نتیجہ نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ ان کی طرز زندگی میں داخل تھی۔ اب جبکہ وہ بحیثیت مسلمان ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے سے روک دیئے گئے تھے یہ کیسے ممکن تھا کہ فوجی ذہنیت کے قبائلی آدمیوں کو ہمیشہ کے لیے پرامن زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جائے؟ پیغمبر اسلام نے خود اس مہم کو روانہ کر کے جس نے موتہ میں شکست کھائی تھی اس سوال کا حل پیش کر دیا تھا۔

۶۳۴ء کے سرما میں تین عرب کالموں نے فلسطین اور شام پر حملہ کر دیا اسی اثناء میں مشرقی عرب کے قبیلوں نے جو حیرہ کی لخمی ریاست کی ضبطی کے بعد سے ایران کے دشمن بنے ہوئے تھے، فرات کی طرف پیش قدمی کر کے حیرہ پر قبضہ کر لیا۔ ۲۰ اگست ۶۳۶ء کو بازنطینی (رومی) قوت نے یرموک کے میدان میں مکمل شکست کھائی اور شام کا تمام علاقہ طوریہ تک عربوں کے قبضہ میں آ گیا۔ فروری ۶۳۷ء میں ایرانی فوج قادسیہ کے مقام پر جو حیرہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا مکمل طور پر تباہ کر دی گئی اور قدیم عراق بشمول ایرانی دارالسلطنت مدائن جو دجلہ کے جنوب میں موجودہ بغداد کے قریب واقع تھا، عربوں کے زیر تسلط آ گیا۔ ۶۴۰ء میں مصر پر حملہ ہوا اور ایک بار پھر بازنطینی حکومت شکست یاب ہوئی اور ستمبر ۶۴۲ء تک پورے مصر پر عرب قبضہ مکمل ہو گیا۔ اسی سال بچی کھچی ایرانی فوج نہاوند کے مقام پر تباہ کر دی گئی اور ایرانی سلطنت کا پورے طور پر خاتمہ ہو گیا۔"

★

دوسری صدی ہجری کے آخر میں ایک ہندستانی راجہ کی طلب پر ہارون الرشید نے بغداد سے ایک متکلم ہندستان بھیجا تھا۔ قرآن کا سب سے پہلا ہندی ترجمہ ایک ہندو راجہ کے حکم سے کیا گیا تھا۔ ۲۷۰ھ میں سندھ کے راجہ مہروگ نے منصورہ (واقع سندھ) کے امیر عبداللہ بن عمر کو لکھا کہ کسی ایسے شخص کو ہمارے پاس بھیجیے جو ہندی میں ہم کو اسلام کا مذہب سمجھائے۔ منصورہ میں اس وقت ایک عراقی مسلمان تھا جو ہندستان میں پلا تھا اور یہاں کی زبانیں جانتا تھا۔ چنانچہ امیر نے اسے راجہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ وہ راجہ کے دربار میں تین برس رہا اور اس کی خواہش سے اس نے ہندی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا جس کو روزانہ پڑھوا کر سنتا تھا۔

چھوٹی صنعتیں

عظیم امکانات

ہندستان ایک عظیم ملک ہے۔ یہاں مقامی طور پر چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے بے حد امکانات ہیں اگرچہ انھیں ابھی تک بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔

ہندستان کے رقبہ کا تقریباً ۲۵ فی صد حصہ جنگلات پر مشتمل ہے ان جنگلات میں بے شمار قسم کی چھوٹی چھوٹی صنعتیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

مثلاً شہد کی مکھی پالنے کی صنعت کو لیجیے، جنوبی کنٹرا کے شری گوڈا نے اس کام کے امکانی فائدے بتائے ہیں۔ انھوں نے مقامی طور پر میسر ہونے والی لکڑی اور بانسوں سے شہد کی مکھیوں کے چھتے بنائے اور پھر انھوں نے ایک سیزن کے پانچ ماہ میں ان چھتوں سے ۳۰۰ کلوگرام شہد نکالا جس کی مجموعی مالیت دو ہزار چار سو روپے تھی۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر شہد کی بڑی مانگ ہے اور دیہاتی علاقوں میں اس کام کی ترقی کے وسیع مواقع موجود ہیں۔ بانس کی کھپچیوں سے بوریئے اور ٹوکریاں بنانے کی صنعت بھی ایسے ہی دھندوں میں سے ایک ہے۔ جسے ترقی دینے کے لیے اس کی ایک مارکیٹنگ تنظیم قائم ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اظہار بانس کے بوریئے بنانے والے ایک کارخانے کو دیکھنے سے ہوتا ہے۔ جو کیرل کے کھادی اینڈ ولیج انڈسٹری بورڈ کے ماتحت ضلع کنانور کے ارپادگاؤں میں واقع ہے اور کوآپریٹیو سوسائٹی کے زیر انتظام ہے۔

اس کارخانے نے "ریڈیکس" نام کی ایک چیز تیار کی ہے جو بانس کی نلی کو کیمیائی عمل کے ذریعہ ٹائیلز کا سستا نعم البدل بناتا ہے۔ بانس ایک ایسا خام مواد ہے جو گھروں کے پچھواڑے میں بھی بڑی آسانی سے اگایا جا سکتا ہے درختوں کے گوند اور ان سے نکلنے والی رال کے ذریعہ ۷۵-۱۹۷۴ء کے دوران ملک کو ۳۲ کروڑ روپے کی بدیشی کرنسی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ دونوں چیزیں سماج کے پسماندہ طبقوں کے بہت سے بیروزگار اور نیم بیروزگار افراد کے لیے کام کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

سال کے بیج جنگلات کی ایک ایسی شے ہیں جن سے دیہاتی معیشت کو فروغ دینے کے زبردست امکانات پائے جاتے ہیں۔ سال بڑی تیزی سے پھلتا پھولتا ہے اور یہ مجموعی طور پر ۹۷ لاکھ ہیکٹیر رقبہ زمین پر موجود ہے جس میں سے بیشتر مدھیہ پردیش، بہار اور اڑیسہ کے قبائلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ سال درخت کے گودے میں ۱۴ فی صد سخت قسم کی چکنائی ہوتی جو صابن بنانے میں کام آتی ہے۔ اسے صاف کر لیا جائے تو اس سے ایک قسم کا مکھن تیار ہو جاتا ہے۔ اس گودے کا تیل نکال لیا جائے تو اس کے پھوک میں ۴۰ فیصد نشاستہ اور ۱۰ فی صد پروٹین ہوتا ہے۔ ہر سال لاکھوں ٹن سال کے بیج پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت مشکل سے ایک فیصد بیج کی فصل اٹھائی جاتی ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ایک ٹن سال کے بیج کو اکٹھا کرنے اور اسے مطلوبہ مقامات پر پہنچانے کے لیے ۷ کام کے دن چاہئیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سال کے بیج سے کتنا بڑا معاشی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ــــ ٹینڈو کے پتوں کی پیداوار اور تجارت سے قبائلی معیشت کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسے عام طور سے بیڑی

پتہ کہا جاتا ہے۔ ان پتوں کو چھانٹنا، توڑنا اور ان کی ٹری بنانا بڑی محنت کے کام ہیں۔ اس دھندے سے صرف مدھیہ پردیش میں ڈھائی لاکھ افراد معقول آمدنی حاصل کرتے ہیں اور ۷۵-۱۹۷۴ء میں صرف مدھیہ پردیش کے دیہاتی علاقوں میں اس کام کے مزدوروں کو چار کروڑ روپیہ تقسیم کیا گیا۔ اس دھندہ کو مزید وسعت دینے کی کافی گنجائش موجود ہے۔

ٹمیڈو کے پتے اس کے بیج بو کر بڑی آسانی سے پیدا کئے جاسکتے ہیں اور پھر انھیں جانور مشکل سے چگ سکتے ہیں۔ ان میں آگ لگنے کا خطرہ بھی کم ہوتا ہے ان کے پودوں کی دیکھ بھال اور انھیں پروان چڑھانے میں بھی زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ اس طرح دیہات کے آس پاس افتادہ زمین میں تمیدو کے پتوں کا ذخیرہ کیا جاسکتا ہے دیہاتی معیشت پر اس کا کتنا خوش گوار اثر ہوگا اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

حالیہ برسوں میں یہ بات مشاہدہ میں آئی کہ ترقی پذیر ممالک بھاری بنیادی صنعتوں کی نسبت چھوٹی صنعتوں میں زیادہ خوش حال اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہمارے جیسے ملک میں ان چھوٹی صنعتوں سے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً ان سے ضرورت مندوں کو مناسب وقت اور مقام پر مناسب روزگار ملتا ہے اور اس کے لیے زیادہ سرمایہ بھی نہیں لگانا پڑتا۔

اس کے علاوہ جنگلات سے کئی بڑی بڑی صنعتوں کو خام مواد ملتا ہے جیسے کاغذ بنانے کے لئے گودا۔ پلائی وڈ۔ وغیرہ۔ ریلوے لائن کو جنگلات میں پیدا ہوئی لکڑی سے ہی سلیپر ملتے ہیں اور وہ لکڑی فراہم ہوتی ہے جو ریل گاڑی کے ڈبے بنانے میں کام آتی ہے۔ جنگلات سے ہی وہ پیکنگ سامان حاصل ہوتا ہے جو پھلوں اور دوسری گھریلو اشیا کی پیکنگ میں کام آتا ہے۔ خوشبو سازی کی صنعت۔ وارنش کی صنعت، کپڑے کی صنعت، اور کئی دوسری چھوٹی اور بڑی صنعتیں ان اشیاء سے فائدہ اٹھاتی ہیں جو جنگلات میں پیدا ہوتی ہیں۔ ●

اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کیجئے آپ کو دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی

پتھر ہر ایک کے لئے سخت ہے۔ البتہ وہ اس کے لئے نرم ہو جاتا ہے جس نے اس کو توڑنے کا اوزار فراہم کر لیا ہو ——— یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو ہر جگہ آپ اپنا حق وصول کر کے رہیں گے۔ اور اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کے لئے اس دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی مفروضہ حق تلفی کے خلاف فریاد و فغاں کرتے رہیں۔

ماحول سے کوئی امید نہ رکھئے، بلکہ اپنی محنت اور لیاقت پر بھروسہ کیجئے۔ آپ کو ماحول سے کبھی شکایت نہ ہوگی۔ ماحول کی شکایت دراصل ماحول سے زیادہ خود اپنی نالائقی کا اظہار ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وہ ناگزیر تیاری نہیں کی تھی جو ماحول سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے ضروری ہے۔

نجات

قرآن جس زمانہ میں آیا، ساری دنیا میں کوئی نہ کوئی مذہب رائج تھا۔ کوئی قوم ایسی نہ تھی جو مذہب کی قائل نہ ہو۔ مگر ہر ایک نے خود ساختہ طور پر کچھ چیزوں کو مذہب اور خدا پرستی کا درجہ دے رکھا تھا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک ایک مقدس جگہ پر جمع ہو کر تالیاں اور سیٹیاں بجانے کا نام عبادت تھا (انفال ـ ۳۵) کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ عبادت خانوں کی عمارتیں بنا کر اور لوگوں کو کھانا کھلا کر اپنے خدا کو خوش کر لیں گے (توبہ ـ ۱۹) کچھ لوگ خدا پرستی کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ انسانی ہنگاموں سے الگ ہو کر اپنے لئے تنہائی کا ایک گوشہ بنا لیا جائے اور وہاں بیٹھ کر خدا کے نام کی جپ کی جاتی رہے (حدید ـ ۲۷) کچھ اور لوگ تھے جو خدا پرستی کا کمال یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں جو افکار و نظریات کا رواج ہو جائے اسی کے رنگ میں رنگ کر مذہب کو بھی پیش کر دیا جائے (توبہ ـ ۳۰)

قرآن نے اعلان کیا کہ ان میں سے کوئی بھی چیز وہ نہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہو، اور جس کے کرنے والے کو وہ آخرت کے انعامات سے سرفراز کرے۔ اللہ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ اس کے بندے اپنے خالق کو "کبیر" مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو "صغیر" بنا لیں۔

یہ اصلاً ایک قلبی کیفیت ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اپنے بندوں کے دل کو دیکھتا ہے۔ دل کا جھکاؤ، دل کا خوف، دل کی فروتنی ہی وہ چیز ہے جو اصلاً خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔ مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ اس کے دل میں جو کیفیت ہو، وہ ضرور اس کے جسم اور اس کی عملی سرگرمیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر ہم کو اپنے بیٹے سے پیار ہو تو ہمارے عمل سے بھی اس پیار کا اظہار ہوگا۔ اگر ہم سانپ سے ڈر رہے ہوں تو ہماری حرکات بھی ضرور اس جذبہ کی گواہی دیں گی۔ اسی طرح خدا کے آگے اپنے آپ کو "صغیر" بنانا اگرچہ باعتبار حقیقت ایک قلبی کیفیت ہے، مگر جب وہ کسی دل کے اندر حقیقی معنوں میں پیدا ہو جائے تو اس کے اعضاء و جوارح اور اس کے حرکات و اعمال سے بھی لازماً اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح پوری زندگی اس کے دائرہ میں آجاتی ہے۔

حقیقی خدا پرستی، جو آدمی کے لئے آخرت کی نجات کا ذریعہ ہوگی، یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو پورے معنوں میں خالق، مالک، رب اور محاسب و مجازی تسلیم کرے۔ اس کے ساتھ کسی معاملہ میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ پھر دل و دماغ میں اسی کی بڑائی کے احساس کو جگہ دے۔ اس کا اندرونی وجود اس کی احسان مندی کے جذبہ سے سرشار ہو اور اسی کی طاقت و قوت کے خوف سے کانپتا رہے۔ پھر اس کا ہاتھ، اس کا پاؤں، اس کی آنکھ، اس کی زبان، اور اس کے سارے اعضاء و جوارح اسی دائرہ کے اندر اپنے وظائف ادا کریں جو خدا نے اپنی شریعت میں ان کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ پھر دوسرے انسانوں سے تعلقات اور دنیا کے مختلف معاملات میں وہ اسی رویہ کو اپنائے جو خدا نے بتایا ہے۔ اور اس رویہ سے پوری طرح بچتا رہے جس سے خدا نے منع فرمایا ہے۔ دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو دنیا کے پیچھے اپنی پوری زندگی لگا دے۔ اسی طرح آخرت کی نجات کا حق دار بھی وہی ہوگا جس نے اپنی زندگی کو اس کے لئے کھپایا ہو۔

مذہب کو انسانی تخلیق ثابت کرنے کے تمام نظریات غلط ثابت ہو گئے

یونانی مصنف ایومیرس (EUHEMERUS) نے کہا تھا کہ دیوتا ابتداءً زمین کے بڑے بڑے بادشاہ تھے پھر دھیرے دھیرے وہ خدا بن گئے اور ان کی پرستش کی جانے لگی۔ بعد کو اس عقیدہ کو بتانے کے لئے ایک اصطلاح اس کے نام پر وضع ہوئی جس کو ایومیرزم (EUHEMERISM) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیوتا کسی زمانہ میں انسانی ہیرو تھے۔ یونانی مصنف کا یہ نظریہ محض قیاس پر مبنی تھا۔ اس نے اس واقعہ پر زیادہ دھیان نہیں دیا کہ چین اور افریقہ اور دوسرے بعض مقامات پر جہاں آباواجداد کی پرستش کی مثالیں ملتی ہیں وہاں ان کی پرستش خدا کی پرستش سے الگ دوسرے طریقے سے کی جاتی ہے۔

قدیم زمانہ میں اس قسم کی باتیں محض تفنن پسند لوگ کیا کرتے تھے۔ تاہم ایک سو سال پہلے بہت بڑے پیمانہ پر اس سوال کے جواب کی تلاش شروع ہوئی کہ مذہب کی ابتدائی شکل کیا تھی۔ مگر تحقیق و تلاش کے لمبے سفر کے بعد آدمی دوبارہ وہیں پہنچ گیا جہاں وہ پہلے تھا۔ اب یہ ثابت ہوا کہ مذہبی معتقدات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی کہ انسانی تاریخ پرانی ہے۔ ایک لاکھ برس پہلے نینڈرتھل انسان (NEANDERTHAL MAN) کو جب مرنے کے بعد دفن کیا گیا تو اس کے ساتھ قبر میں کھانا بھی رکھ دیا گیا تاکہ دوسری دنیا کے سفر میں اس کے لئے زاد راہ کا کام دے سکے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انتہائی "ابتدائی انسان" بھی مرنے کے بعد زندگی کے تسلسل کا عقیدہ رکھتا تھا۔

"مذہب کیسے شروع ہوا" یہ سوال باقاعدہ طور پر صرف ایک سو سال پہلے وجود میں آیا۔ اس سے پہلے بائبل کی کتاب پیدائش اور قرآن کے زیر اثر عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ پہلا انسان (آدم) جب پیدا کیا گیا تو اسی وقت خدا کا الہام بھی اس کو مل گیا جس میں اس کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ سچا مذہب خدا کے نزدیک کیا ہے۔

مذاہب کے علماء عام طور پر یقین کرتے تھے کہ اس ابتدائی مذہب میں بعد کی نسلوں نے پہلی بار بگاڑ پیدا کیا اور اس طرح مذہب کی مختلف شکلیں بنتی چلی گئیں۔ ۱۹ ویں صدی میں خاص طور پر نظریہ ارتقاء نے، تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر یہ ذہن پیدا کیا کہ مذہب کا ارتقائی مطالعہ کرے اور اس کی ابتدائی شکلیں دریافت کرے۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ

بدھزم اور جین ازم کو کئی محققین نے مذہب میں شمار نہیں کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ فلسفہ کے اسکول تھے نہ کہ حقیقۃً مذاہب۔ قدیم زمانہ میں چونکہ علم کلام (تھیالوجی) اور فلسفہ الگ الگ نہ تھے، اس لئے بہت آسانی سے فلسفہ، علم کلام اور علم کلام، فلسفہ بن جاتا تھا۔ جین مت اور بدھ مت دراصل فلسفہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے۔ مگر زمانہ کے اثر سے بعد کو مذہب کی حیثیت اختیار کر گئے — کئی ہندستانی مصنفین مثلاً ڈی۔ ڈی کوسمبی اور رومیلا تھاپر نے بدھزم کو ایک سوشل فلاسفی قرار دیا ہے، نہ کہ عام معنوں میں مذہب۔ (۲۲۸)

ارتقا کا اصول ہر معاملہ میں اسی طرح جاری ہے جیسا کہ
ڈارون نے حیاتیات میں دکھایا ہے۔

ابتدائی مذہب (PRIMITIVE RELIGION)
اور ترقی یافتہ مذہب (HIGHER RELIGION) کی
اصطلاحیں پیدا ہوئیں۔ اس تلاش نے بہت جلد انسان کو
اس دریافت تک پہنچا دیا کہ مذہب کی ابتدا محض کچھ وہمی
خیالات (ILLUSIONS) سے شروع ہوئی۔ دھیرے دھیرے
اصلاح ہوتے ہوتے وہ مذہب کی موجودہ ترقی یافتہ شکلوں
تک پہنچی۔ اس طرح گویا علمی تجزیہ نے ثابت کر دیا کہ مذہب
اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک نفسیاتی یا سماجی وہم کے سوا
اور کچھ نہیں۔ مگر مذہب کے محققین کا یہ یقین دیر تک باقی
نہ رہ سکا۔ تحقیق کے بعد کے نتائج نے اس کے ابتدائی
نتائج کی تردید کر دی۔

ایڈورڈ بی۔ ٹیلر نے ۱۸۷۱ میں مذہب کے بارہ
میں اپنے نظریہ کی وضاحت کے لئے روحیت مظاہر
(ANIMISM) کی اصطلاح وضع کی۔ اس کا مطلب
یہ تھا کہ ابتدائی انسان نے خواب، ہذیان اور موت کے
واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کے اندر کوئی غیر فانی روح
ہے۔ جب کوئی مرا ہوا شخص خواب میں نظر آیا تو سمجھ لیا گیا
کہ انسان کی روح مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، انھیں
میں سے کچھ روحیں دھیرے دھیرے دیوتا بھی بن گئیں۔ اسی
زمانہ میں ہربرٹ اسپنسر نے یہ خیال پیش کیا کہ مرے ہوئے
لوگ جو بھوتوں کی شکل میں دکھائی دیتے تھے، ان کو دیوتا
سمجھ لیا گیا اور ان کی پوجا ہونے لگی۔ مگر ٹیلر اور اسپنسر وغیرہ
کے نظریات کا جب بعد کے محققین نے تجزیہ کیا تو وہ اس
نتیجہ پر پہنچے کہ یہ لوگ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ
دور تاریخ سے قبل کا انسان اسی ڈھنگ پر سوچتا تھا اور
روحوں اور بھوتوں سے خدا تک پہنچنا محض قیاس پر
مبنی تھا۔ اس نظریہ کے حامی اس سوال کا جواب بھی نہ دے
سکے کہ اگر مردہ انسانوں کی روح سے خدا کا تصور نکلا تو یہ عالمی
کیسے بن گیا جب کہ قدیم زمانہ میں کرہ ارض پر پھیلے ہوئے مختلف
قبائل کے درمیان قطعاً کوئی مواصلاتی سلسلہ موجود نہ تھا۔
چنانچہ روحیت مظاہر (اینمزم) کا یہ نظریہ مذہب کی علمی توجیہہ
کی حیثیت سے آج عملاً رد کر دیا گیا ہے۔

روحیت مظاہر کا ایک اور نظریہ آر۔ آر میرٹ نے
۱۸۹۹ میں پیش کیا۔ اس نے کہا کہ انسان اولاً شخصی روح
(PERSONAL SOUL) کو نہیں مانتا تھا بلکہ غیر شخصی
طاقت (IMPERSONAL FORCE) کا عقیدہ رکھتا تھا
جس نے دنیا کو زندگی عطا کی ہے۔ اس نے اپنے اس
نظریہ کو اینیمٹزم (ANIMATISM) کا نام دیا۔ مگر بعد کی
تحقیق نے معلوم ہوا کہ محض ایک لفظی مغالطہ سے اس نے
یہ نظریہ قائم کر لیا تھا۔ بحرالکاہل کے کنارے رہنے والے
بعض قبائل جن کو میلانیسین (MELANESIAN) کہا
جاتا ہے، ان کی زبان میں ایک لفظ منا (MANA) ہے۔
میرٹ نے سمجھا کہ قبیلہ کے لوگ اس کو روحانی طاقت
کے معنی میں بولتے ہیں اور غیر شخصی طاقت کا یہی عقیدہ
مذہب کی بنیاد ہے۔ اس نے مزید کہا کہ قدیم انسان "تھنکر"
نہ تھا بلکہ ایکٹر تھا۔ اس طرح اس کا مذہب جادو سے بہت
کم مختلف تھا۔ مگر بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ یہ قبائل "منا"
کا لفظ غیر شخصی طاقت کے معنی میں نہیں بولتے تھے جس نے
کائنات کو زندگی عطا کی ہو۔ جیسا کہ میرٹ اور دوسرے
لوگوں نے سمجھ لیا تھا، بلکہ امتیازی روحانی صفت کے
معنی میں بولتے تھے۔

۱۸۹۰ میں جیمز فریزر نے کتابوں کا ایک سلسلہ

شائع کرنا شروع کیا جن میں سب سے زیادہ خاص سنہری شاخ (THE GOLDEN BOUGH) تھی۔ اس نے اپنی کتاب کا آغاز ایک "مقدس درخت" کی کہانی سے کیا جو قدیم اٹلی کے ایک مقام اریسیا پر ایک شخص نے لگا رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس درخت میں کوئی روحانی طاقت ہے اور اس کی مدد سے جادو کے کرشمے دکھائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کو لے کر فریزر نے ایک نظریہ وضع کیا، یہ تھا ——— جادو پھر مذہب پھر سائنس :

(MAGIC to RELIGION to SCIENCE)

اس نے کہا کہ جادو کے طریقے میں جب پہلی بار ناکامی ہوئی تو انسان نے سمجھا کہ کوئی مافوق ہستی ہے جو اس کی مدد کر کے کامیابی کو یقینی بنا سکتی ہے۔ اس طرح جادو نے مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ پھر انسان منطقی اور تجرباتی طریقہ تک پہنچا جس کو سائنس کہا جاتا ہے۔ اپنی ارتقائی کشش کی وجہ سے یہ نظریہ شروع میں بہت مقبول ہوا۔ مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ اس مفروضہ کے لئے کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے کہ جادو پہلے تھا اور مذہب اس کے بعد وجود میں آیا۔ کلچر کے ہر مرحلہ میں، تاریخی دستاویزوں کے مطابق، مذہب اور جادو دونوں ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ اس لئے یہ نظریہ کہ "جادو پھر مذہب پھر سائنس" غیر تاریخی (UNHISTORICAL) ہے۔

۱۹۲۲ میں لوسین لیوی برودھل نے ابتدائی ذہن (PRIMITIVE MENTALITY) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ دور قدیم کے وحشی انسان ایک ابتدائی منطقی فکر (PRE-LOGICAL THINKING) استعمال کرتے تھے جو کہ ہماری موجودہ فکر سے مختلف تھا۔ اس نے اس نظریہ پر تنقید کی کہ تمام انسان یکساں صلاحیت کے تھے۔ اس نے مثال دی کہ تمام "غیر ترقی یافتہ" قومیں موت کی توجیہہ فطری اسباب کے سوا دوسرے اسباب سے کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک آدمی سادہ طور پر محض بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے نہیں مرتا بلکہ کوئی پُراسرار طاقت ہے جو اس کو مارتی ہے۔ مگر پچھلے سو برس کے دوسرے شارحین مذہب کی طرح لیوی برودھل بھی محض کرسی نشین مفکر تھا جس کو موجودہ زمانہ کے "ابتدائی انسان" کی خبر نہ تھی۔ حتیٰ کہ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ قدیم انسان کس طرح سوچتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی دور کا انسان بخوبی جانتا تھا کہ موت کس طرح طبیعی اسباب کے تحت ہوتی ہے، اگرچہ اس کے ساتھ وہ ایک روحانی توجیہہ کو بھی اس میں شامل کرتا تھا۔

ایک اور فرانسیسی مصنف امائیل ورخیم نے ۱۹۱۲ میں مذہب پر اپنی کتاب شائع کی۔ اس نے زور دیا کہ مذہب ایک سماجی واقعہ (SOCIAL FACT) ہے نہ کہ انسان کی نفسیات کی پیداوار۔ مذہب وہم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہر دور میں ہر جگہ پایا گیا ہے۔ اس نے اخلاق اور قانون کے بڑے بڑے نظام قائم کئے ہیں۔ تاہم درخیم کے نزدیک مذہب خود سماج کی پرستش کا نام تھا، اگرچہ وہ پُراسرار علامتوں کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے۔ درخیم نے اپنا تصور آسٹریلیا کے بعض قدیم قبائل سے لیا۔ مگر اس انتخاب میں درخیم کی غلطی چھپی ہوئی تھی، کیونکہ وہ کبھی آسٹریلیا نہیں گیا۔ اس نے دوسروں کی فراہم کردہ ناقص معلومات پر اپنے نظریہ کی بنیاد رکھ دی اور پھر اس سے مستنبط کر لیا کہ تمام دنیا کے لوگ آسٹریلیا کے انھیں قدیم قبائل کے مطابق عمل کرتے تھے۔ یہ قدیم قبائل بعض پودوں اور جانوروں کو مقدس مانتے تھے اور ان کو کھانا حرام سمجھتے تھے۔ بعض مشابہتوں کی وجہ

سے ڈرتھیم نے اس کو شمالی امریکہ کے انڈین قبائل کے ٹوٹم (TOTEM) کے مماثل سمجھا اور کہا کہ یہ پودے اور جانور قبیلہ کے سماجی آدرشوں کا نشان تھے جو بالآخر مذہب کی صورت اختیار کر گئے۔ مگر نہ صرف ٹوٹم کا یہ تصور بطور واقعہ ثابت نہیں ہوا، یہ بھی تاریخی طور پر ثابت نہ ہو سکا کہ ٹوٹم کا عقیدہ مذہب کے عقیدہ سے پہلے پایا جاتا تھا۔

اس سے بھی زیادہ کمزور توجیہہ وہ تھی جو آسٹریا کے نفسیات داں سگمنڈ فرائڈ نے ۱۹۱۳ میں پیش کی۔ اس نے اپنی کتاب TOTEM and TABOO میں بحرا کاہل کے علاقہ کے بعض قبائل کی کہانی لکھی کہ قدیم زمانہ میں ایک طاقتور باپ خاندان کی تمام عورتوں کو اپنی ذات کے لئے مخصوص لئے ہوئے تھا۔ بعد کو جب لڑکے جوان اور طاقت ور ہوئے اور باپ بوڑھا ہو گیا تو "ایک دن" انھوں نے مل کر باپ کو قتل کر ڈالا اور عورتوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ مزید یہ کہ یہ قاتلین اپنے مقتول (باپ) کو کھا گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ باپ کی روح ان کے اندر آگئی، جس سے وہ ڈرتے تھے، جس کو برتر سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کچھ جانور مقرر کئے جو باپ کی طاقت کا نشان تھے۔ اس کے بعد انھوں نے جشن منانے شروع کئے جس میں وہ طرح طرح سے اپنے ان عقائد کا اظہار کرتے۔ یہی چیز دھیرے دھیرے مذہب بن گئی۔

مگر اس عجیب و غریب نظریہ کے لئے بعد کے محققین کو کوئی تاریخی ثبوت نہ مل سکا۔ "باپ" کو مذکورہ بالا شکل میں کھا جانے کی مثال امکانی طور پر ساری تاریخ میں صرف آسٹریلیا میں اور وہ بھی ایک بار ملتی ہے اور وہاں بھی شہادتیں بہت غیر فاضح ہیں۔ اس کا کوئی تاریخی، اثریاتی یا اور کوئی شہادت نہیں ہے کہ مذہب اسی طرح بیٹوں کی طرف سے باپ کو قتل کرنے کے واقعات سے شروع ہوا۔ یا یہ کہ مذہب ساری دنیا میں ایک ہی جگہ سے پھیلا ہے یا ہر ملک میں اسی خاص ڈھنگ سے شروع ہوا۔

مذہب کے آغاز کے نفسیاتی یا سماجی نظریات کے بالکل برعکس کچھ مصنفین نے دعوی کیا ہے کہ قدیم ترین مذہبی عقیدہ ایک برتر ہستی کا عقیدہ تھا۔ اینڈریو لینگ (ANDREW LANG) نے ۱۸۹۸ میں مذہب کی تشکیل (THE MAKING OF RELIGION) اور ولہلم اشمٹ (WILHELM SCHMIDT) نے خدا کے تصور کی ابتدا (THE ORIGIN of the IDEA of GOD) شائع کی جس میں شدت سے یہ نظریہ پیش کیا گیا۔ لینگ نے طویل سفر کئے اور برس ہا برس تک تمام دنیا سے شہادتیں جمع کرتا رہا۔ اور بتایا کہ ایک خدا کا عقیدہ انتہائی ابتدائی انسانوں میں پایا جاتا رہا ہے اور اس کو پہلی مذہبی صورت کہا جا سکتا ہے۔ بعد کے مصنفین نے یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ بہت سے ابتدائی قبائل میں ایک خدا کا تصور پایا جاتا ہے، یہ کہا کہ تاہم اسی کے ساتھ دوسرے دیوتاؤں کا تصور بھی ہے۔ اس طرح "ایک خدا" کا تصور گویا کئی خداؤں کو ماننے ہی کا ایک جزو ہے۔

مذہب کے آغاز کے بارے میں پچھلے مفروضوں کے غلط ثابت ہونے کی وجہ سے اب اس میدان میں کام کرنے والے علماء بہت زیادہ محتاط ہو گئے ہیں۔ اگر مذہب اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسانی غور و فکر کی تاریخ پرانی ہے تو وہ اتنے بعید ماضی سے تعلق رکھتا ہے کہ بظاہر ناممکن ہے کہ اس کے آغاز کی بابت کوئی مسلمہ شہادت مل سکے۔ رومانوی محقق (MIRCEA ELIADA) کے الفاظ میں "موجودہ زمانہ کے مورخین مذہب جانتے ہیں کہ یہ ناممکن

ہے کہ مذہب کی ابتدائی شکل کو معلوم کیا جاسکے۔"
ماضی میں مذہب کے محققین کا یہ گمان تھا کہ اگر یہ ثابت کیا جاسکے کہ مذہب کا آغاز کچھ وہمی تصورات سے ہوا تو بعد کی ترقی یافتہ مذہبی شکلوں کو بھی بے بنیاد ثابت کیا جاسکتا ہے۔ مگر اب علمی طور پر اس کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ مذہب کو نفسیاتی فریب PSYCHOLOGICAL ILLUSION یا سماجی فریب (SOCIOLOGICAL ILLUSION) ثابت کرنے کا خواب بے تعبیر ہوچکا ہے۔ اب یہ ذہن پیدا ہو رہا ہے کہ مذہب، جیسا کچھ آج ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے نہ کہ اس کی ابتدائی صورتوں کو دریافت کرنے کی لاحاصل کوشش میں وقت ضائع کیا جائے۔
مذہبی ارتقار کی ابتدائی شکل دریافت کرنے کا ذہن ڈارونزم کے بعد پیدا ہوا تھا۔ یہ فرض کرلیا گیا کہ وحشی قبائل جو آج بھی جنگلوں میں پائے جاتے ہیں، "وہ ابتدائی دور" کے انسان کی باقیات ہیں۔ اور مہذب سماج میں بسنے والے لوگ ترقی یافتہ دور کے انسان۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وحشی قبائل میں مذہب کا جو تصور پایا جائے وہ ابتدائی مذہب کو بتاتا ہے۔ اور مہذب سماج میں جو مذہب ہے وہ مذہب کی ترقی یافتہ شکل کو بتاتا ہے۔ مگر یہ مفروضہ بہت جلدی میں قائم کرلیا گیا جب کہ حقائق اس کی تردید کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر ایسے ابتدائی قبائل ہیں جن میں ایک برتر خدا کا عقیدہ موجود ہے، جب کہ بدھزم کو ماننے والے بہت سے ترقی یافتہ لوگ خدا کو نہیں مانتے۔

Geoffrey Parrinder
Essay in 'Man and his Gods'
(Encyclopedia of the
World's Religions)
London 1974

یہ کرشمہ قرآن کا تھا

اسلام سے پہلے عرب میں تعلیم بہت کم تھی۔ ۸ھ میں جواثا (بحرین، الحسار) جیسے بڑے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تبلیغی خط بھیجا۔ راوی کہتے ہیں کہ سارے علاقے اور قبیلہ میں ایک شخص بھی نہ تھا جو خط کو پڑھ سکے۔ لوگ تلاش کرتے رہے یہاں تک کہ ایک نوجوان طالب نے خط کو پڑھ کر سنایا۔ تقریباً اسی زمانہ کا واقعہ ہے، النمر بن تولب مسلمان ہوئے۔ وہ ایک بڑے قبیلہ کے سردار تھے اور اتنے بڑے شاعر کہ ان کے اشعار کا ایک دیوان تیار ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ان کے قبیلہ عکل (یمن) کا سردار مقرر کرکے ایک تحریری پروانہ عطا کیا۔ مگر وہ اس کو پڑھ نہیں سکتے تھے۔ بازار میں آکر پوچھنے لگے "کیا آپ لوگوں میں کسی کو پڑھنا آتا ہے جو یہ خط پڑھ کر مجھے سنادے"۔ کہا جاتا ہے کہ بعثت نبوی کے وقت شہر مکہ میں مشکل سے ڈیڑھ درجن آدمی ایسے مل سکتے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔ مدینہ میں اس سے بھی کم عرب یہ فن جانتے تھے۔ لیکن دوسری صدی ہجری ہی میں عربی زبان علمی نقطۂ نظر سے دنیا کی متمول ترین زبان بن گئی۔ عربوں میں لسانی ترقی کا زمانہ اتنا مختصر ہے کہ دنیا کی پرانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ حیرت انگیز واقعہ براہ راست قرآن کا کرشمہ تھا۔

عمرآباد

عمرآباد ریاست تامل ناڈو کی ایک چھوٹی سی بستی ہے جو دہلی سے تقریباً ۲۴ سو کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں جامعہ دارالسلام کے نام سے ایک دینی اور عربی مدرسہ ہے جو ۱۹۲۴ میں قائم ہوا تھا۔ ۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۷۷ کو اس کی گولڈن جوبلی "بین اقوامی سطح پر" منائی گئی۔ جامعہ کی خصوصی دعوت پر راقم الحروف کو اس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔

پہاڑوں اور درختوں کے درمیان مدرسہ کی بستی ایسا منظر پیش کرتی ہے جیسے وہ قدرت کی گود میں واقع ہو۔ ابتداءً اس مدرسہ کا قیام ایک فرد کے شخصی حوصلہ سے ہوا۔ کاکا حاجی محمد عمر (م ۱۹۲۷) اس علاقہ کے ایک غریب آدمی تھے۔ مگر نہایت دیانت دار اور باصلاحیت تھے۔ انھوں نے چمڑے کا کاروبار شروع کیا اور نیت کی کہ اللہ ان کے کاروبار کو ترقی دے تو وہ ایک مدرسہ قائم کریں گے۔ حالات نے مساعدت کی اور ان کی "روشن کمپنی" نے اتنی ترقی کی کہ وہ چمڑے کی تجارت کے "بادشاہ" کہے جانے لگے۔ سارے ملک میں ان کی تقریباً ۰ ۸ شاخیں قائم ہوگئیں اور چمڑے کی برآمد سے انھوں نے بہت پیسہ کمایا۔

اب انھوں نے اپنی نیت پوری کی اور ۱۹۲۴ میں اپنے گاؤں کے قریب ایک زمین خرید کر موجودہ مدرسہ تعمیر کیا۔ ابتداءً کاکا خاندان ہی بڑی حد تک اس کا کفیل رہا۔ پھر اطراف کے لوگوں نے زمینیں، باغات اور مکانات اس پر وقف کئے۔ کاکا حاجی محمد عمر صاحب کے بعد ان کے لڑکے کاکا محمد اسمٰعیل (م ۱۹۵۹) اس کی سرپرستی کرتے رہے۔ اب بانی جامعہ کے پوتے کاکا محمد عمر اور کاکا سعید احمد بحیثیت سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری اس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۵۵ سے یہ مدرسہ ایک رجسٹرڈ کمیٹی کے تحت ہے۔ اوقاف کی آمدنی، مقامی تاجروں کے تعاون اور حکومت کی گرانٹ کے ذریعہ اس کا خرچ پورا کیا جاتا ہے۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد جس تعلیمی تصور کے تحت کام کرنا چاہتی ہے، اس کو جامعہ کے معتمد عمومی نے اپنے مختصر مقالہ میں ان لفظوں میں بیان کیا:

"۱۔ عصری درس گاہوں اور مذہبی درس گاہوں کے طلبہ کو ایک دوسرے سے قریب کرنا، کیونکہ اس تفریق سے بڑی نفرتیں اور دوری پیدا ہوتی جارہی ہے صرف طلبہ ہی کے درمیان نہیں اساتذہ کے درمیان بھی کوئی کسی کو سمجھنے یا قریب ہونے کی کوشش نہیں کرتے ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں جس میں اجنبیت کے ساتھ تحقیر بھی ہوتی ہے۔

۲۔ نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا کہ طالب علم کا ذہن علمی اور تطبیقی بن جائے کیونکہ ایک دراز مدت گزار کر بھی دینی مدرسے کے طالب علم اپنے علم و عمل اور افکار و نظریات میں ہم آہنگی نہیں پیدا کرپاتا۔

۳۔ ایسے فارغین پیدا کئے جائیں جن کے پاس اجتہادی صلاحیتیں ہوں اور وہ تہذیب و تمدن اور ترقی یافتہ دنیا کو بتادیں کہ اسلامی نظام ہر دور ہر ملک اور ہر حالت کے لئے موزوں اور سازگار ہے۔

۴۔ ایسے داعی اور مبلغ نکالیں جو اسلام کا پیغام مشرق سے مغرب تک بڑی حکمت اور دانائی سے عام کرسکیں، اور دنیا کے آگے یہ ثابت کرکے رکھ دیں آج کا ذکی انسان اسلامی تعلیمات کا جس قدر محتاج ہے شاید ہی پہلے رہا ہو۔ دنیا کا کھویا ہوا سکون واطمینان صرف اسلام ہی میں نصیب ہوسکتا ہے۔ تھکی ہوئی بیٹھ

کو مذہب اسلام کی دیوار ہی سہارا دے سکتی ہے۔

۵۔ ایک نیا نصابِ تعلیم جس کی بدولت طالبِ علم دنیا کے تمام مذاہب، تحریکوں، تخریبی کوششوں اور غلط رجحانوں سے مکمل واقفیت حاصل کر سکے۔ مزید برآں یہ نصاب طالب علم کے لئے با عزت اور خوش حال زندگی کی ضمانت دے۔ اگر وہ سیکولر اسٹیٹ میں بھی دعوتِ دین کا کام کرنا چاہے "۔

گولڈن جوبلی (المہرجان الذہبی) میں چند قسم کے پروگرام رکھے گئے تھے:

(۱) تعلیمی کانفرنس جس میں تعلیم کی اہمیت اور مسائل پر تقریریں ہوئیں (۲) مرکز تحقیقات اسلامی و تخصص فی الدعوۃ کا افتتاح۔ اس سلسلہ میں تقریریں ہوئیں اور مرکز کی مجوزہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ (۳) اسلامی نمائش جس میں اسلامی تاریخ اور تعلیمات کو چارٹوں کے ذریعہ نمایاں کیا گیا تھا۔ ایک سیٹھ صاحب کو یہ نمائش اتنی پسند آئی کہ اس کو دیکھنے کے بعد انہوں نے اعلان کیا: نمائش کے تمام اخراجات میں تنہا اپنی جیب سے ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ (۴) جلسہ تقسیم اسناد۔

جامعہ دار السلام عمر آباد کا قدیم منصوبہ تھا کہ وہ اپنے یہاں تصنیف و تالیف کا ادارہ قائم کرے، جہاں اسلام کا تحقیقی کام ہو۔ اب جشن طلائی کے موقع پر اس کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا ہے۔ اس ادارہ کے مقاصد یہ ہونگے:

۱۔ جدید اسلوب میں اسلامی لٹریچر تیار کرنا۔

۲۔ جدید اسلامی موضوعات پر جو لٹریچر اردو یا عربی میں موجود ہے، اس کا انگریزی اور جنوبی ہند کی زبانوں (تلگو، کنڑی، ملیالم، تمل) میں ترجمہ کرنا۔

۳۔ جدید یا قدیم تعلیم یافتہ نوجوانوں کو تصنیف و تالیف کی تربیت دینا۔

مہرجان میں شریک ہونے والوں کا ابتدائی اندازہ تین چار ہزار کا تھا۔ مگر آنے والوں کی تعداد تقریباً دس ہزار ہوگئی۔ ہندوستان کے علاوہ جن ملکوں کے وفود اس موقع پر شریک ہوئے، ان کے نام یہ ہیں: سعودی عرب، مصر، قطر، کویت، لیبیا، اردن، بحرین، یمن، امارات عربیہ متحدہ، زنجبار، سری لنکا، نیز مختلف عرب سفارت خانوں کے نمائندے۔ مجموعی طور پر بیرونی مہمانوں کی تعداد ۵۲ تھی۔

اربابِ جامعہ کی کوششوں سے پہلے ہی مدراس یونیورسٹی سے اس کا الحاق کرا لیا گیا تھا تاکہ " اس کے فارغین معاشی اعتبار سے قوم پر بوجھ نہ بنیں بلکہ خود کفیل رہ کر دین کی خدمت کریں "۔ اب مدینہ کی جامعہ اسلامیہ سے بھی اس کا الحاق ہوگیا ہے۔ سعودی عرب اور قطر وغیرہ سے آنے والے تعلیمی ذمہ داروں نے جشن طلائی کے موقع پر اعلان کیا کہ وہ جامعہ کے فارغین کو اپنے یہاں کی درسگاہوں میں مزید تعلیم کے لئے خوشی کے ساتھ قبول کریں گے۔ جامعہ میں اس وقت طلبہ کی تعداد تقریباً دو سو ہے جن میں کچھ طلبہ سیلون، ملیشیا، مالدیپ اور نیپال کے بھی ہیں۔

جنوبی ہند وہ مقام ہے جہاں تیرہ سو سال پہلے عرب تاجر اترے اور یہاں اسلام پھیلایا۔ عرب دنیا میں پٹرول کی دولت ظاہر ہو کر عربوں کو دوبارہ نئی شکل میں یہ موقع دے رہی ہے کہ وہ دوسرے خطوں میں کام کرنے والے اسلامی اداروں کی تقویت کا باعث بن سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہندستان کا ہر مسلم ادارہ اپنے شعبۂ نشر و اشاعت میں " عربوں سے روابط " کو خاص اہمیت دینے لگا ہے

ان کی زبردست کوشش رہتی ہے کہ اپنے اجتماعات کو عرب مہمانوں کے ذریعہ پُررونق بنا سکیں جو نہ صرف اپنی قرآنی زبان اور عربی لباس کی وجہ سے مسلم حاضرین کے لئے دل چسپی کا باعث ہوتے ہیں بلکہ تالیوں کی گونج میں اپنے ملکوں کی طرف سے گراں قدر مالی عطیات کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ دینی اداروں کے ان عطیات سے کہیں زیادہ مقدار ان کی ان فیاضیوں کی ہے جو وہ ساری دنیا میں سیکولر مقاصد کے تحت کام کرنے والے اداروں کو دے رہے ہیں۔

آج کل یہ صورت حال ہے کہ ہر مسلم ادارہ اپنے "ڈائس" پر عرب شخصیتوں کو بٹھانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اور اگر کسی ادارہ کی دعوت پر کوئی عرب شخصیت ملک میں آگئی تو دوسرے تمام ادارے دوڑ دھوپ شروع کر دیتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس کو اڑا کر اپنے ادارہ میں لے جائیں اور وہاں اس کو شاندار استقبالیہ دے سکیں ــــ "عرب پٹرول" نے نہ صرف دنیا کے اقتصادی نظریات کو متاثر کیا ہے بلکہ شاید خود ہماری دینی قدروں کو بھی بدل ڈالا ہے!

گولڈن جوبلی کے سہ روزہ پروگرام میں ملکی شخصیتوں کے علاوہ عرب مہمان بھی مسلسل شریک رہے جو مختلف عرب ممالک سے آئے تھے۔ ان کی رعایت سے تمام کارروائی عربی زبان میں ہوئی۔ عربی تقریروں کے اردو ترجمے ہوتے تھے اور اردو تقریریں عربی میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ یہ رجحان ابھی حال میں ہمارے مسلم اداروں میں پیدا ہوا ہے۔ ہندستان میں ہونے والی کسی کانفرنس میں عربی زبان کے غلبہ کا محرک اگرچہ زیادہ تر وہی ہوتا ہے جس کے تحت اس سے پہلے مغل دور میں فارسی اور برطانوی دور میں انگریزی کا رواج تھا۔ تاہم اس میں ایک خوشی کا پہلو بھی ہے۔ کیوں کہ اس سے قرآن کی زبان کو فروغ ملتا ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی ہے جو خدا کی کتاب کو اس کی اصل زبان میں سمجھ سکیں۔ قرآن اپنی اصل زبان میں ایک حیرت ناک قسم کا طوفانی کلام ہے جو آدمی کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے، جب کہ ترجمہ کی زبان میں اس کا زور باقی نہیں رہتا۔

اس موقع پر جو تقریریں ہوئیں، وہ عام طور پر رسمی اور سرسری قسم کی تھیں۔ کسی تقریر میں اگر کوئی قیمتی نکتہ آیا تو وہ بھی اکثر برجستہ ترجمہ میں چھوٹ گیا۔ مثال کے طور پر ایک عرب مقرر نے اپنی تقریر میں یہ آیت پڑھی: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۔ مقرر موصوف نے اس سے استنباط کیا کہ دعوت الی اللہ کی فرضیت جس طرح پیغمبر پر ہے اسی طرح آپ کے متبعین پر بھی ہے۔ مگر یہ قیمتی نکتہ اردو ترجمہ میں نہ آسکا۔

ایک عرب مقرر نے کہا کہ اسلام سے قبل یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا۔ اس وقت وہاں کے مقامی عرب مکہ چھوڑ کر پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ مگر یہی عرب صرف ۰۰ سال بعد روم اور فارس کی شہنشاہیتوں سے لڑ گئے، جو اس زمانہ میں ویسی ہی تھیں، جیسی آج کل امریکہ اور روس۔ آج کوئی بھی چھوٹی قوم، جیسے کہ اس زمانہ میں عرب تھے، روس اور امریکہ سے متصادم ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ پھر عربوں کو کس چیز نے یہ حوصلہ اور یقین عطا کیا۔ مقرر نے کہا کہ یہ ایمان اور اعتماد علی اللہ تھا جس نے سو سال سے بھی کم مدت میں ایک قوم کی کایا پلٹ دی۔

ایک عرب مقرر نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو مشورہ دیا:

علیهم ان یهتموا بالحقائق لا بالشکلیات

ان کو چاہئے کہ حقیقت اور معنویت میں اپنے کو لگائیں نہ کہ

اشکال اور ظواہر ہیں۔ مگر مہرجان کا رنگارنگ ماحول اور رسمیات کا اہتمام زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ پرجوش مقرر (مشکل ہے) اس نکتۂ خطابت کے لئے حاضرین سے کوئی داد پانے کی امید کر سکتے ہیں۔

جشن سیمین کی تقریبات کی ایک نشست میں مرکزی وزیر پٹرولیم مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا بھی شریک ہوئے۔ عربوں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنی تقریر کا آغاز السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ سے کرتے ہیں۔ مسٹر بہوگنا کی موجودگی میں اس قسم کی متعدد تقریریں ہوئیں۔ بعد کو جب وہ اسٹیج پر آئے تو انھوں نے بھی اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا "السلام علیکم"۔ شری بہوگنا کی زبان سے السلام علیکم سن کر سارا مجمع جھوم اٹھا اور دیر تک تالیاں بجتی رہیں پھر انھوں نے کہا کہ "بھارت اور عربوں کے درمیان کوئی مال دولت کا رشتہ نہیں ہے، یہ ایمان کا رشتہ ہے۔ مال دولت کے رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ مگر ایمان کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا"۔ اس پر بھی خوب تالیاں بجیں۔ اگر تالیوں کی کثرت کو دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسٹر بہوگنا کی تقریر سب سے زیادہ عوام پسند ثابت ہوئی۔ کئی عرب ملکوں کے نمائندوں نے اپنی تقریر کے بعد جامعہ دارالسلام کے لئے ڈالر اور پونڈ کے عطیات کا اعلان کیا تھا۔ مسٹر بہوگنا نے کہا کہ ہندستان ایک غریب ملک ہے۔ اس لئے میں آپ کی جامعہ کے لئے اس قسم کے کسی عطیہ کا اعلان نہیں کر سکتا۔ البتہ ہم اپنی نیک خواہشات آپ کے لئے پیش کرتے ہیں۔

راقم الحروف نے اس موقع کے لئے ایک مقالہ تیار کیا تھا جس کا عنوان تھا:

دعوت اسلامی کے جدید امکانات

اس مقالہ کو تقریری شکل میں ملخصاً، ۱۰ اپریل کی شام کی نشست میں پیش کیا گیا۔ الرسالہ کی پچھلی اشاعت میں یہ پورا مقالہ شائع ہو چکا ہے۔

کئی درجن عرب مہمان جو مختلف ملکوں سے اس مہرجان میں آئے تھے، ان میں سے شاید کوئی مجھ کو شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔ مگر غائبانہ طور پر تقریباً سبھی مجھ کو بخوبی جانتے تھے بلکہ میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔

ایک دن شام کو ڈائس پر میری کرسی ایک یمنی عرب (شیخ احمد عبدہ ناشر) کے قریب ہو گئی۔ میں نے ان سے کہا:

هل سمعت عن الكاتب الهندي بدعي بوحيد الدين خان

اس نے جواب دیا "کیا الاسلام یتحدی کے مؤلف"۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا، کیا آپ ہی وہ ہیں۔ میں نے مسکرا کر کہا شاید۔ یہ سنتے ہی وہ بے قرار ہو گیا۔ اس نے کہا، میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے۔ بڑی عظیم کتاب ہے۔ پھر وہ عرب انداز میں مجھ سے اظہار محبت کرنے لگا۔ اس نے اپنے یہاں کے ایک ممتاز عالم کا پتہ دیا اور کہا کہ وہ آپ سے بہت متاثر ہیں، ان سے خط و کتابت کیجئے:

الشیخ عبدالمجید الزندانی
رئیس مکتب التوجیہ والارشاد العام
ص۔ب۔ ۲۴۹
صنعاء۔ الجمہوریۃ العربیۃ الیمنیۃ

اس کے بعد انھوں نے قریب کے دوسرے عربوں سے کہا "دیکھو یہاں شیخ وحید الدین ہیں"۔ اب دوسرے عرب حیرت کے ساتھ مجھ سے ملنے لگے۔

جنوبی ہند کے ایک بزرگ نے میرا نام پوچھا۔ میں [illegible]

نے کہا "عبداللہ"۔ مگر یہ توریہ کام نہ آسکا۔ چند منٹ
بعد ہی انھوں نے میرا اصل نام دریافت کرلیا اور اس کے
بعد باصرار اپنی رہائش گاہ پر لے گئے۔ جنوبی ہند کا علاقہ
ہر اعتبار سے شمالی ہند سے اتنا مختلف ہے کہ بالکل دوسرا
ملک معلوم ہوتا ہے۔ تاہم ان میں کثیر تعداد میری جاننے والی
تھی خصوصاً اہل علم تو تقریباً سبھی جانتے تھے۔

کسی اجتماع میں یہ صورت حال کبھی میرے لئے
پسندیدہ نہیں ہوتی۔ میری گوشہ گیر اور خلوت پسند
طبیعت کو گم نامی سب سے زیادہ محبوب ہے۔ مگر یہ قلم بھی
شاید ایک فتنہ ہے جو آدمی کو "تنہا" نہیں ہونے دیتا۔
حالاں کہ تنہائی سے زیادہ قیمتی کوئی چیز انسان کیلئے نہیں۔

عمرآباد میں میں نے ایک شخص سے کہا: میرا جی چاہتا ہے
کہ میں "قلم" کا مشغلہ ترک کردوں اور کسی مسجد میں معتکف
ہو کر قرآن اور نماز میں مشغول ہو جاؤں۔ انھوں نے کہا،
کیا آپ اس بات کو لکھ کر شائع کر سکتے ہیں۔ میں نے جواب
دیا، کیوں نہیں۔ جو بات میرے دل میں ہے، اس کو
چھپانے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

اگرچہ قرآن میں عَلَّمَ بِالْقَلَمِ اور نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا
یَسْطُرُوْنَ جیسی آیتیں شامل ہیں۔ مگر ۲۵ برس تک
قلم کا تجربہ کرنے کے بعد اب میری آخری تمنا یہ ہے کہ کسی
سنسان مسجد میں روپوش ہو جاؤں۔ وہاں گم نامی کی زندگی
گزاروں۔ نماز پڑھوں اور قرآن و حدیث میں مشغول رہوں
اور اسی حال میں دنیا سے چلا جاؤں۔ مجھے نہیں معلوم کہ
میری یہ تمنا پوری ہوگی یا نہیں۔ کیونکہ دو چیزیں ہر وقت
آدمی کا پیچھا کر رہی ہیں۔ ایک، ذمہ داری کا احساس،
دوسرے موت۔

شمالی ہند کے ایک مسافر کے لئے جنوبی ہند کی جو
خصوصیت سب سے زیادہ محسوس ہوتی ہے، وہ یہاں
کی بے تعصبی ہے۔ یہاں مختلف فرقوں کے درمیان کسی قسم
کی کوئی کش مکش نہیں۔ مذہب کے نام پر جھگڑے کا یہاں
کوئی وجود نہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت،
شمالی ہند کے برعکس، یہاں تقریباً ایک ہی قسم کی ہے۔
اس کی وجہ سے یہاں دونوں فرقوں کے درمیان قریبی
تعلقات ہیں۔ کوئی اِس مذہب کو مانتا ہے یا اُس مذہب
کو، یہاں اس قسم کے سوالات پر کوئی اپنا دماغ نہیں
خراب کرتا۔

ان حالات نے جنوبی ہند کو دعوت حق کے کام کے
لئے ایک آئیڈیل خطہ بنا دیا ہے۔ یہاں نہایت عمدہ طور پر
وہ کام ہو سکتا ہے جس کے لئے دوسرے مقامات پر طرح
طرح کی رکاوٹیں کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر کیسی عجیب
بات ہے کہ مواقع کی اس فراوانی نے مسلمانوں کو کوئی سبق
نہیں دیا۔ سارے جنوبی ہند میں، شمالی ہند ہی کی طرح،
کوئی ایک بھی قابل ذکر جماعت نہیں جو دین کو پھیلانے
اور دوسری اقوام میں اس کو متعارف کرنے کا کام کر رہی
ہو۔ جس خطہ نے ہزار برس پہلے عرب تاجروں کا
استقبال دین حق کے مبلغ کی حیثیت سے کیا تھا، آج وہ
انھیں عربوں کا استقبال اس حیثیت سے کرنے میں
مسابقت دکھا رہا ہے کہ وہ اپنے "پٹرو ڈالر" کے
خزائن کا کوئی جز اس کی طرف بھی پھینک دیں۔ آج
ہندستان کے تمام دینی ادارے عربوں کے پیچھے
دوڑ رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی کلمات استغفار
کی تلاوت کرتے ہوئے اس مقدس طواف میں مشغول
ہے اور کوئی تکلف کو برطرف کرکے سیدھے سیدھے اس
سنہری حوض میں داخل ہو جانا چاہتا ہے۔

جامعہ دار السلام کے معتمد عمومی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں یاد دلایا کہ جنوبی ہند کا خطہ وہ مقام ہے جہاں عرب تاجر سب سے پہلے اترے اور اسلام کو پھیلایا:

"آج ہماری چشم تمنا دعا کے ہاتھ پھیلائے منتظر ہے کہ عرب کی ارض مقدس سے پھر کوئی قافلۂ تجارت رواں دواں ہو جس کے کچھ انوار و آثار بھی دکھائی دے رہے ہیں جو اپنے ہمراہ قدرت کے عطا کردہ دنیوی مال تجارت کے ساتھ اخروی تجارت کا سرمایۂ نجات بھی رکھتا ہو، اور اس طرح اور ایک بار دکھی انسانیت اسلام کی روحانی و اخلاقی فتوحات کا نظارہ کرسکے اور پوری دنیا اسلام کے نور سے جگمگا اٹھے۔ آمین"

۱۷ اپریل کو جب کہ میں ٹامل ناڈو سپر فاسٹ اکسپریس سے واپس آرہا تھا، چیر کار میں میری نظر سامنے کی پلیٹ پر پڑی۔ لکھا ہوا تھا:

PLEASE DO NOT PLAY RADIO
EXCEPT WITH AN EARPHONE

یعنی ریڈیو مت بجائیے۔ اگر بجانا چاہیں تو بالکل آہستہ بجا کر کان کے آلہ کے ذریعہ خود سن لیجیے۔

تاہم یہ ضابطہ صرف مسافروں کے لئے تھا۔ خود ریلوے کو گویا یہ لائسنس ملا ہوا تھا کہ وہ اپنے اہتمام میں پُرشور طور پر ٹیلی وژن چلائے اور اپنے نظام کے تحت بجائے ہوئے ریڈیو کے گانے سننے پر لوگوں کو مجبور کرے۔ ایر کنڈیشنڈ بوگی ہمارے اور باہر کے شور کے درمیان حائل تھی۔ مسافروں کے ممکنہ شور سے بھی ہم بچے ہوئے تھے۔ مگر ریلوے کے اوپر کون قدغن لگا سکتا تھا جو "نوائز پلیوشن" کا لامحدود حق اپنے لئے محفوظ کئے ہوئے تھی ـــــ اگر لوگ اپنے لئے بھی وہی پسند کرنے لگیں جس کی تلقین وہ دوسروں کو کرتے ہیں تو دنیا کے کم از کم آدھے مسئلے یک لخت حل ہو جائیں۔

جب ٹیلی وژن چلتا تو ساری نگاہیں اس کے شیشہ پر لگ جاتیں۔ ایک سردارجی نے گلاس میں شراب کے ساتھ برف اور کوکا کولا ملایا اور لطف لے کر پینے لگے۔ کچھ لوگ اپنے بیوی بچوں میں مشغول تھے اور کچھ کھانے پینے میں۔ کچھ تاش کے ذریعہ وقت گزاری کر رہے تھے۔ کوئی ناول اور افسانہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔

ایک طرف بند ڈبہ کے اندر یہ مشاغل جاری تھے۔ دوسری طرف ڈبہ کے باہر قدرت کی دنیا اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔ سپر فاسٹ اکسپریس ہندستان کے سرسبز میدانوں اور پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے گویا فطرت کی لامتناہی ریل ہمارے سامنے کھول رہی تھی۔ ہرے بھرے درختوں کے سلسلے، پھیلا ہوا آسمان، بادلوں کے آفاقی مناظر، سورج کی ضیاپاشیاں، یہ ساری چیزیں ایک عظیم کائناتی شو کی طرح مسلسل آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ زندگی، عظمت، حسن اور معنویت کی جو اتھاہ کہانی اس خاموش کائناتی ٹیلی وژن سے نشر ہو رہی تھی اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مگر مسافروں کو ڈبے کے اندر کے کھلونوں سے فرصت نہیں تھی کہ وہ باہر کی عالمی رونقوں کو دیکھ سکیں۔ ہر ایک نے اپنے قریب ایک مشغلہ تلاش کر لیا تھا اور اسی میں وہ مشغول تھا۔ میں نے سوچا: لوگ کہتے ہیں کہ خدا ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتا۔ وہ لوگ جو سامنے کی کثیف کائنات کو دیکھنے کی نگاہ بھی نہ رکھتے ہوں، وہ اس کے پیچھے لطیف خدا کی ہستی کا مشاہدہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ خالق کو دیکھنے کے لئے مخلوق کو دیکھنے کی نظر پیدا کرنی پڑتی ہے۔ جو مخلوق کو نہ دیکھ سکے، وہ خدا کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ خالق نے اپنی صنعت کا شاہکار ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جو لوگ اس کی بے قدری کریں وہ کیسے توقع کرتے ہیں کہ خدا اپنی تجلیات کو ان کے اوپر ظاہر کرے گا۔

حق اپنی کامل عریاں شکل میں صرف آخرت
میں ظاہر ہوگا۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے
یہاں کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ
یہاں وہ حق کو مشتبہ اور ملتبس شکل میں
سامنے لے آتا ہے (انعام ـ ۹) وہ حق کے
علم بردار کو فرشتہ کی صورت میں کھڑا
نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے اوپر بشریت کا لباس
اوڑھاتا ہے۔ تاکہ لوگوں کو وہ اپنے ہی جیسا
ایک انسان دکھائی دے:

"نبیؐ نے جب اپنی قوم کو حق کا پیغام دیا تو
انکار کرنے والوں نے کہا، ہم تو دیکھ رہے ہیں
کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو اور ہم دیکھتے
ہیں کہ تمھارا ساتھ صرف ان تھوڑے سے
لوگوں نے دیا ہے جو ہم میں پست ہیں اور جن کی
سمجھ بھی کم ہے۔ اور تمھارے اندر ہم کو اپنے
مقابلہ میں کوئی بڑائی بھی دکھائی نہیں دیتی۔
ہمارا تو خیال ہے کہ تم خدا کے نمائندے نہیں ہو، تم
صرف جھوٹا دعویٰ کر رہے ہو۔ (ہود ـ ۲۷)

مومن اور غیر مومن کی تعریف اگر حقیقت کی زبان
میں کی جائے تو وہ یہ ہوگی:

مومن وہ ہے جو دلیل اور معقولیت کے الفاظ میں
بات کو سمجھ لے۔ غیر مومن وہ ہے جو بات کو صرف
اس وقت سنے گا جب کہ خدا کی چنگھاڑ بلند ہو،
اگرچہ اس وقت کا سننا کسی کے کچھ کام نہ
آئے گا۔

شہد: ایک عجیب نعمت

قرآن کی سورہ نمبر ۱۶ میں ارشاد ہوا ہے:

"تیرے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی
کہ تو پہاڑوں میں گھر بنائے اور درختوں میں بھی اور لوگ
جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں۔ پھر ہر قسم کے پھلوں سے
رس چوس۔ پھر اپنے رب کے راستوں میں چل جو آسان
ہیں۔ اس کے پیٹ میں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس
کی رنگتیں مختلف ہیں۔ اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔
اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہے جو سوچتے ہیں"
(نحل ـ ۶۹)

شہد نہ صرف ایک لذیذ قدرتی غذا ہے۔ بلکہ وہ
قدیم ترین زمانہ سے علاج کے کام میں بھی آتا رہا ہے۔
شہد کی تیاری کے لئے خدا نے جو حیران کن انتظام کیا ہے
اس پر موجودہ زمانہ میں کافی معلومات جمع کی گئی ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک جزء حیرت انگیز حد تک
عجیب ہے۔ تاہم یہ تحقیقات ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچی ہیں
خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے کتنے پہلو ابھی انسان کے
علم میں آنے باقی ہیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ شہد میں لوگوں کے
لئے شفا ہے۔ حال میں اس سلسلے میں ایک حیرت انگیز
دریافت ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

علم طب کے مطابق جراثیم بیماریاں پیدا کرتے ہیں
جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ شہد ان جراثیم کو مارنے
کے لئے نہایت موثر ہے۔ اگرچہ یہ بات انسانیت کو بہت
قدیم زمانہ سے معلوم تھی کہ شہد بیماریوں سے بچانے کے
لئے بہت کامیاب ہے مگر سائنسی طور پر اس کا مظاہرہ

ابھی صرف بیسویں صدی میں کیا جا سکا ہے۔

ڈاکٹر ڈبلیو۔جی۔ساکٹ (Dr W.G. Sackett) جو اس سے پہلے فورٹ کولنس کے کولوریڈو ایگریکلچرل کالج سے متعلق تھے، وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ شہد بیماریوں کو پھیلاتا ہے اور اس میں جراثیم اسی طرح پلتے ہیں جس طرح دودھ میں۔ مگر ان کو بے حد تعجب ہوا جب اس کے برعکس انھوں نے دیکھا کہ وہ تمام بیماری کے جراثیم جو انھوں نے خالص شہد میں ڈالے، بہت جلد مر گئے۔ وہ جراثیم جو ٹائیفائڈ کا بخار پیدا کرتے ہیں، وہ خالص شہد کے اندر ۴۸ گھنٹے میں مکمل طور پر ختم ہو گئے۔ وہ جراثیم جو آنتوں کا ورم پیدا کرتے ہیں، وہ بھی شہد میں صرف ۱۰ گھنٹہ تک زندہ رہ سکے۔ گلے کی بیماریاں پیدا کرنے والے بعض جراثیم کافی سخت جان ثابت ہوئے۔ تاہم وہ بھی شہد کے اندر چار دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ جراثیم کی ایک قسم جو چھوت کی خطرناک بیماریاں پیدا کرتی ہے، وہ تجربہ کے پانچویں روز مردہ پائی گئی۔

شہد کی اس جراثیم مار خصوصیت کی وجہ ڈاکٹر بوڈوگ بیک (Dr Bodog Beck) کے نزدیک یہ ہے کہ شہد کے اندر رطوبت کو جذب کرنے کی صلاحیت (Hygroscopic Ability) ہے۔ شہد سادہ طور پر صرف یہ کرتا ہے کہ وہ جراثیم کے اندر کی رطوبت کی تمام مقدار مکمل طور پر کھینچ لیتا ہے۔ جراثیم، دوسری تمام ذی حیات اشیاء کی طرح، پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اس لئے شہد جب ان کی ساری رطوبت کھینچ لیتا ہے تو وہ فوراً مر جاتے ہیں۔

شہد کی رطوبت کو جذب کرنے کی صلاحیت تقریباً لامحدود ہے۔ اس کی یہ قوت اتنی زبردست ہے کہ وہ لوہا، شیشہ اور پتھر تک کی رطوبت کو کھینچ لیتا ہے۔

Rosicrucian Digest
California 95191 U.S.A.
September 1975, P. 11

خدا فضا سے انسان کے لئے پانی برساتا ہے۔ مویشی کے پیٹ سے لذیذ دودھ نکالتا ہے۔ درختوں سے طرح طرح کے میٹھے پھل پیدا کرتا ہے۔ مکھیوں کو اس نے شہد جیسی قیمتی چیز تیار کرنے کا کارخانہ بنا دیا ہے۔ پھر بھی انسان خدا کی کاریگری پر غور نہیں کرتا، پھر بھی انسان خدا کا شکر ادا نہیں کرتا۔

نبوت کے چھٹے سال جب عمر فاروق رضؓ اسلام لائے تو انھوں نے مسجد حرام میں جاکر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ قریش کے لوگ ان سے لپٹ گئے۔ دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔ بالآخر حضرت عمر رضؓ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"جو تمھارے جی میں آئے کرو۔ خدا کی قسم اگر ہم تین سو آدمی ہو جائیں تو پھر یا ہم اس سرزمین کو تمھارے لئے چھوڑ دیں گے یا تم اس کو ہمارے لئے چھوڑ دو گے"

نبوت کے چودھویں سال بدر کے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ ارشاد کس قدر صحیح تھا۔

حضرت عمر فاروق رضؓ کی خلافت کے زمانہ میں عمرو بن العاص رضؓ مصر کے محاذ پر تھے انھوں نے لکھا کہ فتح میں تاخیر ہو رہی ہے۔ خلیفہ دوم نے جواب میں لکھا:

"تم کو جاننا چاہئے کہ تمھارے ساتھ بارہ ہزار آدمی ہیں اور بارہ ہزار کبھی قلت کی وجہ سے شکست نہیں کھاتے"

فاروق اعظم کے اس ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ تین سو آدمی انقلاب لانے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ اور اگر یہ تعداد بارہ ہزار تک پہنچ جائے تو پھر فریق ثانی کی کسی بھی تعداد کے مقابلہ میں محض عددی کمی کی بنا پر شکست نہیں ہو سکتی۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ہماری ایک ایک جماعت بلکہ ایک ایک قائد کو لاکھوں کی تعداد میں کارکن ملے۔ مگر وہ اسلام کی تاریخ میں ناکامی کی مثالوں کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کر سکے۔" (الاسلام، صفحہ ۱۶۴)

اس موضوع کی تفصیل کے لئے

الاسلام کا مطالعہ کیجئے

الاسلام

صفحات ۲۴۰

قیمت مجلد مع پلاسٹک کور ۱۵ روپے۔ مجلد بغیر کور ۱۳ روپے

اسلام اور مسائل حاضرہ کا ایک جامع مطالعہ

اپنے موضوع پر اس نوعیت کی پہلی کتاب

ابواب :

جدید مسئلہ کیا ہے

حقیقت دین

ارکان اربعہ

صراط مستقیم

اسوۂ نبوت

تحریک اسلامی، سیرت کی روشنی میں

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں

تعمیر ملت

دعوت الی اللہ

دعوت اسلامی کے جدید امکانات

آخری بات

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 532
REGD. R. N. No. 28822/76
AUGUST - 1977

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 6 (India)